مثبت تخلیقی رویوں کا عکّاس

مدیر

انیس امروہوی

مثبت تخلیقی روّیوں کا عکّاس

مارچ، اپریل ۲۰۰۷ء

مدیر

انیس امروہوی

قصے

(۸)

مارچ اپریل ۲۰۰۷ء

مدیر	انیس امروہوی
حسن ترتیب	ڈاکٹر نیر جہاں
معاون مدیر	مسعود التمش
سرورق	نسیم امروہوی
قانونی مشیر	ناصر عزیز ایڈووکیٹ
کمپوزنگ	رچنا کار پروڈکشنز، لکشمی نگر، دہلی ۱۱۰۰۹۲

عام شمارہ	: ۴۰؍روپے
زرسالانہ	: ۱۶۰؍روپے
رجسٹرڈ ڈاک سے	: ۲۵۰؍روپے
تاحیات	: ۳۰۰۰؍روپے
بیرون ممالک سے	
فی شمارہ	: ۵؍امریکی ڈالر
زرسالانہ	: ۲۰؍امریکی ڈالر

ہمارے تقسیم کار:

- مو‌ڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹۔ گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۲
- مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی۔۶
- بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ۔۴
- ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ (یو۔پی۔)
- کتب خانہ انجمن ترقی اردو، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی۔۶

ISBN-81-87231-90-4

رابطہ : 104/B، یاور منزل، آئی بلاک، لکشمی نگر، دہلی۔۱۱۰۰۹۲

Ph: 011-65295989, 22442572 Email: qissey@rediffmail.com

پاکستان میں قصے سے رابطہ:

☆ طفیل اختر، پرائم ٹائم پبلی کیشنز، F-122، بلاک-N، ماڈل ٹاؤن، لاہور۔۵۴۷۰۰

☆ اکرام تبسم، بنگلہ نمبر 133- عباس بلاک، مصطفےٰ ٹاؤن، لاہور۔

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر انیس امروہوی نے شکتی پرنٹرس، انصاری روڈ، دریا گنج، نئی دہلی سے چھپوا کر دفتر **قصے**، 104/B، یاور منزل، آئی بلاک، لکشمی نگر، دہلی۔۱۱۰۰۹۲ سے شائع کیا۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ کا ایک اور علمی کارنامہ

اردو زبان اور لسانیات

گوپی چند نارنگ

اردو کے جلیل القدر ادیب اور مرکزی ساہتیہ اکادمی کے صدر پروفیسر گوپی چند نارنگ کی تازہ ترین علمی کتاب 'اردو زبان اور لسانیات' رام پور رضا لائبریری کے زیر اہتمام شائع ہوگئی ہے۔ یہ کتاب پچیس انتہائی اہم علمی اور تحقیقی مضامین پر مشتمل ہے جو اردو زبان کے تاریخی ارتقا اور پس منظر کو صدیوں کی ملی جلی تہذیب اور ثقافت کے آئینے میں بڑی علمی اور تکنیکی مہارت سے پیش کرتے ہیں۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اپنی پوری زندگی اردو ادب، تاریخ، ثقافت اور لسانیات کی خدمت میں صرف کی ہے۔ ان کے اس خیال سے سبھی متفق ہوں گے کہ اردو زبان ہندوؤں اور مسلمانوں کے اشتراک کی نشانی ہے اور ہندوستان کی ایک ہزار سالہ گنگا جمنی تہذیب کی امین ہے۔ نارنگ صاحب کے خیال میں اردو کا رسم الخط بھی بڑی ثقافتی اور تاریخی اہمیت کا حامل ہے جسے تبدیل کرنا زبان کی شخصیت کے قتل کے مترادف ہے۔

اس اہم کتاب میں ایسے مضامین منتخب کیے گئے ہیں جن سے اردو زبان کی تاریخ، خصوصیات اور رسم الخط کے مختلف پہلوؤں پر گہری روشنی پڑتی ہے۔ نیز اردو کی ہیئت، اس کی صوتیات، اسلوبیات اور بہت سارے تکنیکی مسائل کو بڑے ہی دلکش طور پر پیش کیا گیا ہے۔ کتاب میں پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ، صدر شعبۂ لسانیات علی گڑھ یونیورسٹی کا عالمانہ اور مبسوط 'پیش لفظ' شامل ہے۔

صفحات: 440 قیمت: 450 روپے

رام پور رضا لائبریری

قلعہ رام پور، رام پور 244901 (یوپی)

ترتیب

اس شمارے میں

اداریہ

خصوصی مطالعہ

افسانے

غزلیں

دوزاویے

نظمیں

تجزیہ

نفسیات

کتابیات

بازگشت

جہانِ کتب

○○

قارئین ''قصے'' کو انتہائی دُکھ کے عالم میں یہ اطلاع دی جا رہی ہے کہ مدیر قصے انیس امروہوی کے بے حد قریبی دوست حفیظ آتش امروہوی کا گزشتہ ۱۱ر جنوری ۲۰۰۷ء بروز جمعرات کو امروہہ میں انتقال ہو گیا۔ حفیظ آتش کی شخصیت اور ان کی نظموں کے حوالے سے ایک تاثراتی مضمون قصے کے آئند شمارے میں پیش کیا جائے گا۔ _ ادارہ

انیس امروہوی

انسان، انسانیت اور سماج

دُنیا گول ہے۔ ہزاروں برس تک انسان یہی سمجھتا اور مانتا رہا۔ مگر جیسے جیسے تحقیق و تسخیر کا سلسلہ آگے بڑھتا رہا، انسان کا یہ مفروضہ غلط ثابت ہوا، اور پتہ چلا کہ دنیا نہ صرف یہ کہ گول نہیں ہے بلکہ اپنی دُھری پر سیدھی بھی نہیں ہے۔ لہٰذا تحقیق و تسخیر کا یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے، ہر نئی تحقیق کے ساتھ انسانی ترقی کے نئے نئے دروازے وا ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ انسانی ترقی کی رفتار بہت مدھم تھی، برسوں میں کہیں جاکر کوئی نئی ایجاد سامنے آتی تھی اور لوگ حیران رہ جاتے تھے۔ چند گنے چنے بڑے شہروں کے لوگ ہی نئی نئی ایجادات کا فیض و لطف اُٹھا پاتے تھے، اور ایک بڑی تعداد جو چھوٹے شہروں، قصبوں یا دیہات میں آباد تھی، ترقی کی ان برکات سے فیضیاب نہیں ہو پاتی تھی۔ ایک زمانہ میں ریڈیو کی ایجاد نے سب کو چونکا دیا تھا مگر اس کے بعد ٹرانسسٹر آ گیا اور پھر ٹیلی ویژن نے حیران کر دیا۔ اسی طرح پہلے ٹیلی فون پر بات کرنے کے لیے گھنٹوں انتظار کرنا پڑتا تھا اور اب سیکنڈوں میں ہزاروں میل کے فاصلے پر آسانی سے بات ہو جاتی ہے، اور پھر موجودہ دور میں انٹرنیٹ اور موبائل تو بالکل کرشمے جیسے ثابت ہوئے۔ آج بڑی سے بڑی بات ہو جانے پر بھی لوگ زیادہ حیران نہیں ہوتے۔

گزشتہ صدی کے آخری چوتھائی حصے میں انسان نے دنیا بھر میں جتنی ترقی کی ہے، اور جتنی تیز رفتاری سے ترقی کی ہے، انسانی تاریخ میں اس کی مثال پہلے کبھی نہیں ملتی۔ آج دنیا بھر کے دانشور، سائنسداں اور سیاستداں یہ کہتے نہیں تھکتے کہ اب یہ تمام دنیا ایک گلوبل ویلج میں تبدیل ہو چکی ہے اور دنیا کا گلوب اب انسانی مٹھی میں سما چکا ہے۔ وقت کی طنابیں انتہائی حد تک کھنچ چکی ہیں۔ ساری دوریاں مٹ گئی ہیں اور انسان نے بے پناہ ترقی کر لی ہے۔ اس میں کوئی شک بھی نہیں ہے کہ آج کے انسان نے سائنس کے شعبہ میں حد درجہ ترقی کی ہے۔ خاص طور پر الیکٹرانک اور میڈیکل سائنس نے انسان کو اس کی سوچوں سے بھی آگے کے نتائج دیے ہیں۔ مگر اس سب کے باوجود خود انسان اپنے مرتبے سے، اپنے درجے سے اور

اپنے انسان ہونے سے کتنا گرا ہے اور کتنی پستی میں چلا گیا ہے، کیا اس کا حساب خود انسان کے بنائے ہوئے کسی کمپیوٹر نے لگایا ہے؟ تاریخ گواہ ہے کہ جب سے انسان نے ہوش کے ناخن لیے ہیں، انسانیت کو سب سے زیادہ نقصان انسان کے ذریعہ ہی پہنچا ہے۔ چاہے معاملہ استعماریت کا ہو، یا پھر مذہب کے نام پر ہوئی ہزار ہا جنگوں اور فرقہ وارانہ فسادات کا ہو یا پھر سیاسی سازشوں بھری پوری انسانی تاریخ رہی ہو، انسان کے ہاتھوں ہی سب سے زیادہ انسانی جانوں کا اتلاف ہوا ہے۔ خود انسان نے انسانیت کو جتنا شرمسار کیا ہے، کسی دوسرے جاندار نے اتنا نہیں کیا ہے۔ اس کی حالیہ مثال ہمارے سامنے موجود ہے کہ کس طرح ایک جھوٹ کا سہارا لے کر ایک پورے ملک کو تاراج کیا گیا اور پھر اس جھوٹ کو نبھانے کے لیے اس ملک کے سربراہ کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ جس ظلم، بربریت، تشدد اور دہشت گردی کا رونا رو کر جارج ڈبلیو بش نے یہ سب کیا اور دنیا نہ صرف یہ کہ تماشائی بنی دیکھتی رہی، بلکہ بہت سوں نے اپنے اپنے مفادات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کے سُر میں سُر بھی ملایا۔ کیا وہی ظلم، بربریت، تشدد اور دہشت گردی خود اس کے ہاتھوں نہیں ہو رہی ہے۔ ویتنام اور فلسطین سے لے کر افغانستان اور عراق تک میں ہزار ہا بے گناہ بچے، بوڑھے اور عورتیں اس جارح کے ظلم و ستم کا شکار نہیں ہوئے؟ انسانیت کی دہائی دینے والے نے کیا کبھی انسان کو انسان سمجھا ہے؟ خود ہمارے ملک بھارت نے خاموشی اختیار کر کے ظالم کا ساتھ نہیں دیا ہے؟ ہم کون سی سبھیتا اور پرمپراؤں کی بات کرتے ہیں؟

آج ہمارے سامنے سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ کیا ہمارے اپنے ملک میں انسانیت اپنے انسانی وجود میں محفوظ ہے؟ ہماری آزادی اگلے چند ماہ میں سٹھیانے جا رہی ہے۔ کیا یہاں کا انسان آج آزاد ہے؟ کیا وہ اپنے انسان ہونے پر فخر محسوس کرتا ہے؟ ایک عام انسان آج سانس لینے میں بھی سوچتا ہے کہیں اس میں کوئی سیاست تو نہیں ہے، غریبی لائن سے نیچے کی آبادی دن دونی رات چوگنی رفتار سے بڑھتی جا رہی ہے اور دوسری طرف جن لوگوں کے پاس سیاسی سائبان ہیں، انہیں آنے والی دولت گننے کی مہلت بھی نہیں ہے۔ یہ زمین مافیا، یہ صنعتی مافیا، یہ سیاسی مافیا کس طرح انسانیت کا گلا گھونٹ رہے ہیں، کوئی سوچ رہا ہے؟ عام آدمی کو سوچنے کی فرصت ہی کہاں ہے۔ اس کو تو اِن لوگوں نے روزی روٹی کے چکر میں الجھا دیا ہے جو خود کچھ نہیں کرتے۔ سرکاری اور وقف کی جائیدادیں بیچتے ہیں، ایمان بیچتے ہیں، وعدے بیچتے ہیں، نفرتیں بیچتے ہیں اور موقع محل دیکھ کر خود کو بھی بیچ ڈالتے ہیں۔ میرا خیال ہے آزادی ملنے سے قبل کے سو برسوں میں اس ملک کو انگریزوں نے اُتنا نہیں لوٹا ہوگا جتنا آزادی حاصل ہونے کے بعد ساٹھ سال کے عرصے میں خود اس ملک کے ٹھیکہ داروں نے اس ملک کو لوٹا

ہے۔ ملک ایک ہے، قوم ایک ہے، آزادی اور جمہوریت ایک ہے، مگر قدرتی ندیوں کے پانی پر آپس میں جھگڑا ہے۔ کل شاید ہوا اور دھوپ کے بٹوارے پر بھی جھگڑا ہوگا۔ سڑکوں پر بھی جھگڑا ہے۔ تیری گاڑی میری سڑک پر کیوں چلتی ہے۔ اسی بات پر جھگڑا ہے۔ عوام جائے بھاڑ میں...... پہلے سرکاریں عوامی بھلائی کے کام کیا کرتی تھیں مگر اب سرکاریں وہ راستے ڈھونڈھتی ہیں جن پر عوام کو لوٹا جا سکے۔

کتنی عجیب بات ہے کہ آزادی کے ساٹھ برس ہونے پر بھی ہم انسان کو پینے کا صاف پانی مہیا نہیں کرا پائے۔ لوگوں کو اچھی صحت نہیں دے پائے، ہر دیش واسی کے سر پر ایک چھت نہیں دے پائے بلکہ اس کے سر پر ذمہ داریوں کا بوجھ ہی لادتے رہے۔ ملک میں مکمل خواندگی کا ٹارگیٹ پورا نہیں کر پائے کیونکہ جہاں ملک کی مہا پنچایت میں ہمیں ان سب مسائل پر غور وفکر کرنا تھا وہاں تو ہم نے اکھاڑا بنا رکھا ہے۔ ہمیں کہاں فرصت ہے ان سب باتوں پر سوچ وچار کرنے کی، کیونکہ ہم تو گجرات کی نسل کشی اور بابری مسجد کی شہادت پر مجرموں کو کلین چٹ دینے میں لگے رہے۔ ہم تو عام انسان کو انسانیت کی دُہائی دے کر بیوقوف بنانے میں لگے رہے۔ خود کو خاص بنانے کی تکڑموں میں عام آدمی کو اور زیادہ عام بنانے میں لگے رہے۔ اپنے معاشی مفادات کو حاصل کرنے کے لیے ملک کی معاشیت کو برباد کرنے میں لگے رہے۔ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو روزگار دینے کی بجائے چھوٹی چھوٹی صنعتوں کو ختم کر کے، دستکاری کو برباد کر کے بے روزگاری میں اضافہ کرتے رہے۔ آج بڑی آسانی سے ہندوستان کا عام انسان بھی گھر بیٹھے یہ دیکھ لیتا ہے کہ اس کے منتخب کیے ہوئے نمائندے ایوان نمائندگان کیا گل کھلا رہے ہیں۔ جن لوگوں کو عوام کے لیے مثال بننا تھا، ان میں سے بڑی تعداد تو مختلف قسم کے جرائم میں ملوث ہے، گھوٹالوں میں نام کما رہے ہیں۔ کئی تو قتل جیسے سنگین معاملوں میں پولیس کو مطلوب ہیں، پھر بھی عوامی نمائندے ہیں۔ کئی تو جیل سے ہی انتخاب میں حصہ لے کر اور فاتح کر آجاتے ہیں اور پھر آزاد گھومتے ہیں، چاہے کتنے ہی سنگین جرم میں ان پر مقدمہ زیر سماعت ہو۔

ہمارے قومی کھلاڑی انٹرنیشنل کھیل کے میدان میں بھی زلفیں سنوارنے میں لگے رہتے ہیں۔ ان کی توجہ کھیل پر کم اور اس بات پر زیادہ ہوتی ہے کہ راست ٹیلی کاسٹ ہو رہے میچ میں ان کا کوئی پوز خراب نہ ہونے پائے، جس سے آئندہ ان کو ملنے والے اشتہارات کی آمدنی کم ہونے کا اندیشہ بنا رہتا ہے۔ وہ ملک وقوم کے لیے کب کھیل رہے ہوتے ہیں؟ وہ تو اپنی اسٹار ویلیو بڑھانے کے لیے پوز دے رہے ہوتے ہیں، خود کے لیے کھیل رہے ہوتے ہیں۔ کھیل کا کیا ہے، کھیل تو ہوتے ہی رہتے ہیں اور ہار جیت بھی لگی رہتی ہے۔ بس ان کی ماڈلنگ ویلیو کم نہیں ہونی

چاہیے۔ ملک وقوم شرمسار ہو تو کیا...... بعد میں عوام سب بھول جاتے ہیں اور ملک بھی معاف کر دیتا ہے۔ میرے خیال سے کوئی بھی کھلاڑی جب تک ٹیم میں ہو، اس پر ہر قسم کے اشتہار کرنے پر مکمل اور سختی سے پابندی عائد ہونی چاہیے۔

ہمارے ملک میں لاکھوں کی تعداد میں ایسے لوگ بھی ہیں جن کا عیش و آرام دوسروں کی کمائی ہوئی دولت سے چلتا ہے۔ وہ خود کچھ نہیں کرتے، صرف ایسے راستے بناتے ہیں جن پر چل کر دوسروں کی کمائی خود ان تک پہنچ جاتی ہے۔ ابھی حال میں ایک ایسی بھکارن کا پتا چلا ہے جو نہ صرف یہ کہ ہزاروں روپے انشورینس کی قسط ادا کرتی ہے بلکہ لوگوں کو قرضے دے کر سود میں بھی کافی بڑی رقم کماتی ہے۔ مندروں، درگاہوں اور دوسرے مذہبی مقامات پر کتنی بڑی تعداد میں لوگ صرف بھیک مانگنے یا بھینٹ چڑھائی ہوئی دولت پر ہی عیش کر رہے ہیں۔ انہیں دنیا کے گلوبل ویلج میں تبدیل ہونے سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ نہ ہی ان کو اس بات سے کچھ لینا دینا ہے کہ ان کی وجہ سے انسانیت کتنی شرمسار ہوتی ہے۔

یہاں مجھے اختر الایمان کا ایک شعر یاد آرہا ہے......

شرم آتی ہے کہ اس ملک میں ہم رہتے ہیں
نہ ملے بھیک تو لاکھوں کا گزارا ہی نہ ہو

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ بے شک انسان نے بہت ترقی کر لی ہے، اور ماؤز کے ذریعہ دنیا کا گلوب اس کی مٹھی میں بھی آگیا ہے، اور بھی بہت کچھ ہوا ہے، مگر کیا ہم نے اخلاقی طور پر انسان کو انسان بنانے کے لیے بھی کچھ کیا ہے؟ سماج میں نفرتیں پھیلانے اور سماج کو بانٹنے والے عناصر کے لیے بھی کچھ کیا ہے؟ انسان کو انسان سمجھنے کے لیے ذہنوں کو تیار کیا ہے؟ انسانوں پر ٹنوں گولہ بارود برسانے والوں، اور ظالم کا ساتھ دینے والوں کے لیے بھی کچھ سوچا ہے؟ میرا خیال ہے کہ ہماری ساری ترقیاں اس وقت تک بیکار ہیں جب تک دنیا کا ہر انسان اپنے انسان ہونے پر فخر محسوس نہ کرے، اور یہ تب ہی ہوگا جب ہم صدق دل اور صاف ذہن سے ایک دوسرے کو انسان سمجھیں گے، اور اپنے طور پر ہر فرد انسان بننے کی ہر ممکن کوشش کرے گا۔

☆☆☆

یوم آزادی ۱۵ راگست ۲۰۰۶ء سے ہندوستان میں دُوردَرشن کی طرف سے پہلا اُردو ٹیلی ویژن چینل وزیر اعظم ہند جناب من موہن سنگھ صاحب کے وعدے کے مطابق اور اُن کے ہی دست مبارک سے شروع کرا کے اس بڑے ملک کے تقریباً تیس کروڑ عوام کے

دلوں کی آرزو پوری کی گئی ہے۔ میں اپنی طرف سے اور تمام اُردو دوستوں کی طرف سے حکومتِ وقت کو دِلی مبارکباد پیش کرتا ہوں، اور اس سلسلے میں اس محکمہ سے متعلق دُوردَرشن اور آکاش وانی کے بارے میں چند باتیں بھی قارئین کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں:

۱۔ (الف)...... اردو چینل کو خوش اسلوبی کے ساتھ چلانے اور معیاری اردو پروگرام ٹیلی کاسٹ کرانے کے لئے کیڈر کنٹرولنگ اتھارٹی کی حیثیت سے ڈی۔ جی، AIR نے دُوردَرشن کی طرف سے مانگنے پر بھی اردو جاننے والے افسران دُوردَرشن کو نہیں دیے ہیں، اُن کا عذر یہ ہے کہ اُن کے پاس اسٹاف کی کمی ہے، یا یہ کہ اُردو افسران کے بدلے دُوردَرشن AIR کو متبادل کے طور پر پروگرام افسران ریڈیو کو بھی دے۔ جبکہ کچھ عرصہ قبل ہی ڈی۔ جی AIR نے دُوردرشن کو دہلی AIR سے تین غیر اردو پروگرام آفیسرز کو بغیر دُوردرشن کی کسی ڈیمانڈ کے بھیجا ہے۔ اِس بات سے ایسا لگتا ہے کہ کچھ لوگ نہیں چاہتے کہ دُوردَرشن کے اُردو چینل کو خوش اسلوبی کے ساتھ چلانے کے لیے اردو جاننے والے باصلاحیت اور تجربہ کار افسران کا تعاون حاصل ہو، اور اردو کے معیاری اور زیادہ معلوماتی / انفارمیٹیو پروگرام پیش کیے جاسکیں۔ اس طرح اردو زبان وادب سے اور اردو کی مخصوص تہذیب سے تعلق رکھنے والے افسران اگر اردو چینل کو نہیں چلائیں گے، تو حکومتِ وقت کا یہ دعویٰ کہ اردو چینل اقلیتوں کی زبان اور تہذیب کی نمائندگی کرے گا، کھوکھلا ثابت ہوگا اور اقلیتوں کا اعتماد موجودہ سرکار میں بحال نہ ہو سکے گا۔

(ب)...... دُوردَرشن کے اردو چینل کو دہلی اور نئی دہلی کے بیشتر کیبل آپریٹر نہیں دکھا رہے ہیں۔ جبکہ یہ سرکاری چینل ہے۔ میرے خیال سے دُوردَرشن کے تمام چینل دِکھانے لازمی کردیے جائیں اور ایسا نہ کرنے پر کیبل آپریٹر کا لائسنس منسوخ کرنے کا قانون بھی بنایا جائے، یا سرکار ایک مناسب شرح (ریٹ) قائم کرکے کیبل آپریٹنگ سسٹم کو اپنے ہاتھ میں لے سکتی ہے، جس سے ہندوستان کا ہر فرد اپنی مرضی کا چینل اپنی مرضی کے مطابق دیکھ سکے۔

(ج)...... دوردرشن کا اُردو چینل روز صبح چار گھنٹے اور شام کو چار گھنٹے دکھایا جاتا ہے۔ یعنی چوبیس گھنٹے میں صرف آٹھ گھنٹے کا پروگرام ٹیلی کاسٹ ہوتا ہے۔ ان آٹھ گھنٹوں میں بھی چار گھنٹے کے پروگرام پُرانے والے ری ٹیلی کاسٹ ہوتے ہیں۔ اس طرح کل ملاکر چار گھنٹے کے نئے پروگرام ہی دوردرشن پر یومیہ ٹیلی کاسٹ ہوتے ہیں۔ بقول ظفر......

دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں

”جو شخص اپنے محسن کا وفادار نہ ہو، وہ انسان کہلانے کا مستحق نہیں، وہ تو حیوان کے زمرے میں آتا ہے۔“

— شیخ سعدیؒ

ولی محمد چودھری

کا پہلا افسانوی مجموعہ

صفحات: ایک سو ساٹھ

قیمت: ایک سو پچاس روپے

ٹارگیٹ انڈسٹریز

کٹکوئی اسٹریٹ، امروہہ۔ ۲۴۴۲۲۱ (یو۔پی)

Ph: 05922-263890

اس طرح تمام دن کے لیے کیوں کوئی کیبل آپریٹر اپنا ایک ٹرانسمشن اس برائے نام اردو چینل کے لیے مخصوص کرے گا؟ میرا خیال ہے کہ اردو چینل کو فوری طور پر چوبیس گھنٹے کا پروگرام کر دینا چاہیے اور اس کے زیادہ سے زیادہ پروگرام نئے اور حالات حاضرہ پر مبنی ہونے چاہئیں۔

۲۔ اب اس محکمہ کے دوسرے شعبہ "آل انڈیا ریڈیو" کی طرف قارئین کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں، جس کی اردو سروس نہ صرف ہندوستان میں، بلکہ اطراف کے ممالک میں بھی بڑے غور وفکر کے ساتھ سنا جانے والا پروگرام ہے۔ یہی وہ پروگرام ہے جس کے ذریعہ ہم پڑوسی ملک کے غلط اور بیہودہ پروپیگنڈہ کو بھی انکاؤنٹر کر سکتے ہیں۔ اس اردو سروس کی طرف خصوصی طور پر آپ کی توجہ دلاتے ہوئے چند باتیں اس محکمہ کے گوش گزار کرنی ہیں۔ آل انڈیا ریڈیو میں بہت ہی منظم طریقے اور چالاکی سے اردو زبان کو پوری طرح ختم کرنے کی کوششیں کی جارہی ہیں۔ اس کی مثال اس طرح دی جاسکتی ہے کہ......

(الف)...... کچھ عرصہ قبل تک اے۔ آئی۔ آر کے نیشنل چینل، نئی دہلی سے ۲۵ منٹ کا ایک پروگرام "منظر" روزانہ نشر کیا جاتا تھا۔ اب اس پروگرام کو سات دن کے بجائے ہفتہ میں صرف چھ دن نشر کیا جاتا ہے۔ اب یہ پروگرام اتوار کو نشر نہیں ہوتا ہے۔ پچھلے پانچ برس سے تو اس چینل پر کوئی پروگرام آفیسر بھی نہیں تھا۔

(ب)...... AIR دہلی اسٹیشن پر روزانہ چالیس منٹ کا اردو پروگرام نشر کیا جاتا ہے۔ باوجود اس کے یہاں نہ کوئی مستقل پروڈکشن اسسٹنٹ ہے اور نہ ہی کوئی اناؤنسر مقرر ہے۔ یہاں ایک اردو جاننے والا آفیسر ہی خود سارے کام انجام دیتا رہا ہے مگر اب اُسے بھی کہیں اور ٹرانسفر کر دیا گیا ہے۔

(ج)...... اردو جاننے والے افسروں کو اردو پروگرام کے بجائے یا تو کوئی اور سیکشن دے دیا گیا ہے یا دہلی سے باہر ٹرانسفر کر دیا گیا ہے۔

(د)...... آکاشوانی دہلی سے نشر ہونے والا پروگرام "اردو مجلس" ۱۹۶۲ء سے روزانہ راجدھانی چینل پر نشر ہوتا ہے۔ اس چینل کے سامعین روزانہ میڈیم ویو (M.W.) 450.5 میٹر یعنی 666Khzt. پر اپنا ریڈیو ٹیون کرتے ہیں۔ لیکن گزشتہ کچھ عرصہ سے اردو کا یہ مقبول پروگرام کسی یتیم بچے کی طرح در در کی ٹھوکریں کھا رہا ہے۔ جب کبھی کوئی کرکٹ میچ ہوتا ہے (جو اکثر ہوتے رہتے ہیں) تو اردو مجلس کے پروگرام کو "یوواوانی" چینل پر منتقل کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح اردو مجلس کے خاص سامعین کئی کئی دن تک راجدھانی

چینل پر اپنا پسندیدہ اردو مجلس پروگرام نہیں سن پاتے ہیں اور ڈھونڈتے رہ جاتے ہیں۔ خاص طور پر دہلی سے باہر کے سامعین یہ پروگرام اس لیے بھی نہیں سن پاتے ہیں کیونکہ ''یوواوانی'' پروگرام صرف دہلی کے نوجوانوں کے لیے مخصوص ہے، جبکہ راجدھانی چینل باہر کے متعدد شہروں اور کئی صوبوں تک میں سنا جاتا ہے۔

(۵)...... دہلی اور اطراف دہلی میں اردو بولنے اور پڑھنے والوں کی ایک بڑی تعداد موجود ہے۔اس کے باوجود یہاں سے ''یوواوانی'' اردو کا الگ سے کوئی چینل آج تک شروع ہی نہیں کیا گیا۔ جبکہ ہندی اور انگریزی میں یوواوانی بدستور نشر کئے جارہے ہیں۔

(۳)......آل انڈیا ریڈیو کی ''اردو سروس'' ایک زمانے میں بی بی سی کے بعد اردو کی سب سے زیادہ مقبول اور باوقار سروس تھی اور اس کے شیدائی سامعین ہندوستان کے کونے کونے میں اور برصغیر میں کئی جگہ بڑی تعداد میں تھے۔مگر اب یہ اردو سروس ہندوستان کے زیادہ تر علاقوں میں سنائی ہی نہیں دیتی۔ جبکہ نئی تکنیک کے اس زمانے میں اردو سروس اور زیادہ بڑے اور وسیع علاقے میں پہلے سے کہیں زیادہ واضح طور پر سنائی جاسکتی ہے اور اردو زبان کے شیدائیوں کو زیادہ معیاری اور مقبول پروگرام نشر کرسکتی ہے۔کیا کسی سازش کے تحت اس مقبول پروگرام کے دائرے کو وسیع کرنے کے بجائے تنگ تر کیا جارہا ہے؟

اردو سروس کے تعلق سے درج ذیل چند باتیں خصوصی توجہ کی طالب ہیں......

(الف)......آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس میں اردو جاننے والے اسٹاف کی بے حد کمی ہے۔ جس کی وجہ سے تقریباً ۷۰ رفیصد پروگرام پُرانے ہی نشر کیے جارہے ہیں یعنی ریپیٹ پروگرام نشر ہورہے ہیں۔ جبکہ DTH پر اب یہ اردو سروس چوبیس گھنٹے سُنی جاسکتی ہے۔

(ب)...... اِتنی بڑی اردو سروس کو باقاعدہ اور پُروقار طریقے پر چلانے کے لیے ریڑھ کی ہڈی مانے جانے والے افسران یعنی پروگرام ایگزیکیوٹیو صرف چار رہ گئے ہیں، اور ستم بالائے ستم یہ کہ ان میں سے دو افسران تو ایسے ہیں جو نہ تو اردو لکھ سکتے ہیں اور نہ ہی پڑھ سکتے ہیں۔ ایک تیسرے پروگرام ایگزیکیوٹیو صاحب ایسے ہیں جو اردو زبان وادب کی تہذیب اور اس کے بیش قیمت سرمایہ سے ناواقف ہیں۔اِس وقت اِس سروس میں صرف ایک پروگرام ایگزیکیوٹیو اردو داں ہے جبکہ وہاں کم از کم چار اردو داں پروگرام ایگزیکیوٹیوز کی ضرورت ہے۔

(ج)...... اردو سروس میں اب صرف دو اناؤنسر اردو داں باقی رہ گئے ہیں۔ بقیہ تین خواتین اناؤنسر کی مادری زبان بھی اردو نہیں ہے،جن میں سے دَو غیر اردو داں ہیں جن کو اردو ہی

نہیں آتی ہے۔ ان سب کی زبان پر دوسری زبان کے لب و لہجے کا بہت زیادہ اثر ہے۔

(د)...... اردو سروس جیسے مقبول پروگرام میں کئی اناؤنسر ایسے ہیں جن کی اردو اناؤنسمنٹ میں دوسری زبانوں کے الفاظ بڑی تعداد میں بے جا طور پر استعمال ہوتے ہیں اور سامعین کی جگہ شروتا (श्रोता)، آداب کی جگہ نمسکار (नमस्कार)، اور خط کی جگہ پتر (पत्र) پڑھتے ہیں جنھیں سُن کر سوچنا پڑتا ہے کہ کیا واقعی ہم اردو سروس سن رہے ہیں؟

(ہ)...... گزشتہ آٹھ برس سے اردو سروس میں موسیقی، معیاری ڈرامے اور فیچرس کے پروگرام ایگزیکیٹو بھی نہیں ہیں۔

(و)...... اردو سروس میں اردو جاننے والے اسٹاف کی بے حد کمی کی وجہ یہ بھی ہے کہ نئے اردو اسٹاف کی بھرتی کافی عرصے سے نہیں ہوئی ہے، اور جو اردو اسٹاف پہلے تھا، ان میں سے کئی ریٹائر ہو گئے اور کئی کا تبادلہ ہو گیا۔ کیا یہ اردو اسٹاف کی نئی بھرتی کا نہ ہونا اور اردو والوں کا تبادلہ غیر ضروری طور پر اِدھر اُدھر کر دینا اس اردو سروس کو نقصان پہنچانے یا دھیرے دھیرے اسے ختم کرنے کی کوئی سازش تو نہیں ہے؟

آخر میں یہی کہنا چاہوں گا کہ آکاشوانی کی اردو مجلس، آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس اور دوردرشن پر نئے اردو چینل کے سلسلے میں ان بنیادی باتوں پر وقت رہتے توجہ نہیں دی گئی اور وقت رہتے ان کے لیے مثبت قدم نہ اُٹھائے گئے تو اردو زبان و ادب اور اردو والوں کا تو بہت زیادہ نقصان ہوگا ہی، مگر اس سے اقلیتوں میں موجودہ سرکار کے خلاف بھی ایک پیغام جائے گا کہ یہ سرکار نہ صرف اردو دشمن ہے بلکہ اقلیتوں کی زبان اور تہذیب کی بھی حفاظت کرنے کے لائق نہیں ہے۔

میرا خیال ہے کہ جلد سے جلد ان نکات کو پارلیامنٹ کے کسی اجلاس میں اُٹھایا جائے اور اس بات کی تحقیق کرنے کے لیے ایک کم مدتی تحقیقاتی کمیشن بھی بنایا جائے کہ اس ملک میں اس ملک کی پیدا شدہ اور مقبول ترین زبان کو سرکاری اداروں میں کون لوگ نقصان پہنچا رہے ہیں اور جو حکومتِ وقت سے بھی دشمنی نبھا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ، ہندوستان کی مختلف اردو انجمنیں اور اکادمیاں بھی ان معاملات پر خاص نگاہ رکھیں کہ کہاں کہاں اردو کے کاز کو نقصان پہنچ رہا ہے اور وقت وقت پر حکومتِ وقت کو بھی جگاتے رہیں۔ ○○

اسرار گاندھی

صد سالہ جشن سجاد ظہیر کے موقع پر

سجاد ظہیر

کا سب سے بڑا یادگار کارنامہ

روشنائی

انجمن ترقی پسند مصنفین کی مکمل تاریخ، جو جیل میں رہ کر مرتب کی گئی۔ سجاد ظہیر نے یہ تاریخ سینٹرل جیل، مچھ، بلوچستان میں ۷ارجنوری ۱۹۵۴ عیسوی کو مکمل کی۔ اردو کی ادبی تاریخ میں ترقی پسند ادبی تحریک کئی معنوں میں ایک ممتاز مقام رکھتی ہے۔ علی گڑھ تحریک کے بعد یہ اردو کی سب سے بڑی تحریک ہے۔ سجاد ظہیر نے اُسی ترقی پسند ادبی تحریک کا سفرنامہ ''روشنائی'' کے عنوان سے اس کتاب میں پیش کیا ہے۔ ''روشنائی'' کا مطالعہ جہاں پڑھنے والوں کو ترقی پسند ادبی تحریک کی ابتدائی منزلوں سے آشنا کراتا ہے، وہیں نئے مسائل کو سلجھانے کے لیے تیار بھی کرتا ہے۔ عصری حالات میں تخلیقی ادب کو عوام کی اُمنگوں سے ہم آہنگ کرنے میں اور نئے ادیبوں کو آگے بڑھانے میں اور تمام عوام دوست لکھنے والوں کو اکٹھا کرنے میں اس تحریک نے ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔

صفحات: ۳۵۲ قیمت: ۲۵۰/روپے دیگر ممالک میں: دس امریکی ڈالر

(ہندوستان میں)

شائع کردہ:

پرائم ٹائم پبلی کیشنز

ماڈل ٹاؤن، لاہور۔ (پاکستان)

ہندوستان میں ملنے کا پتہ:

تخلیق کار پبلشرز

104/B، یاور منزل، آئی بلاک، لکشمی نگر، دہلی۔ ۱۱۰۰۹۲

خصوصی مطالعہ

ڈاکٹر محمد حسن

اِرتکازِ فن کا شاعر: معین احسن جذبیؔ

بہت کم شاعروں کو شعر کہتے وقت اتنی محنت کرتے دیکھا ہے جتنی جذبیؔ کرتے ہیں۔ شعر کہتے وقت کم اور اسے بناتے سنوارتے وقت زیادہ۔ جب تک ان کو مطمئن کرنے والا لفظ نہ ملے، اس وقت تک بے چین رہتے ہیں اور لفظ کے انتخاب کے پیمانے ان کے یہاں بہت سخت ہیں۔ ہر لفظ بعینہٖ وہی مضمون ادا کرتا ہو جو اُن کے پیش نظر ہے۔ پھر وہ صوتی اعتبار سے بھی خوشگوار آوازوں کا مجموعہ ہو، اس کے بعد کی پیدا کردہ آوازیں یا تُر (نہ صرف صوتی اعتبار سے بلکہ معنوی اعتبار سے بھی) شعر کے دوسرے لفظوں سے میل کھاتے ہوں اور یہ تمام سُر مل کر ایک آہنگ اور نغمے میں ڈھل جائیں۔ لفظ کا یہ معنوی اور صوتی انتخاب اور پھر ان سبھی لفظوں کی مناسبت اور مترنم ترتیب اور پھر ان کے وسیلے سے اپنے مافی الضمیر کی موزوں ادائیگی۔ یہ سب مرحلے جذبیؔ کے لئے جتنے جان لیوا ہیں، اتنے ہی ضروری بھی ہیں۔ ان کے بغیر ان کی شاعری کی دقت پسندی، آسانی اور روانی کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ اسی بنا پر تو حافظ نے شاعری نہیں، زندگی کے بارے میں کہا تھا......

این قدر دانم کہ دشوارست آساں زیستن

دراصل جذبیؔ کا پورا فن محض اِرتکاز کا فن ہے۔ وہ اپنی توجہ کو اِدھر اُدھر بھٹکانے کے بجائے پوری جمعیت خاطر سے صرف تجربے اور اس کے فوری متعلقات پر مرکوز کرتے ہیں۔ اسی لئے ان کی شعری تخلیقات کی تعداد کم ہے مگر ان کی تقریباً سبھی شعری تخلیقات میں خاص قسم کی گونج بلکہ آواز بازگشت پائی جاتی ہے جو اُن کی پہچان بن گئی ہے۔ گویا غزل کے ارتکاز کو بھی انہوں نے شعر کے تخلیقی ارتکاز کا درجہ دے دیا ہے۔

اس اعتبار سے جذبیؔ کو محض غزل کا شاعر قرار دینا مناسب نہیں۔ انہوں نے نظمیں بھی لکھی ہیں اور نہایت کامیاب نظمیں لکھی ہیں۔ طوائف، مجاز پر مرثیہ، نقاد سے خطاب، نیا سورج (اور یہ گویا نمونے کے طور پر صرف چند نظمیں ہیں) فرق صرف یہ ہے کہ ان سبھی نظموں میں اس دور

کی اکثر نظموں کی طرح بے جا طوالت یا تکرار سے پرہیز کیا گیا ہے اور جذبے کا ارتکاز نمایاں ہے۔ ایسا ارتکاز جو آج بھی نظموں میں خاصہ کم یاب ہے۔ اس نقطۂ نظر سے جذبی کی سبھی کامیاب نظمیں اور غزلیں اسی کیفیت ارتکاز کی مثالیں ہیں۔

اس ارتکاز کا آخر راز کیا ہے؟ سیدھے الفاظ میں بیان کریں تو اس کا راز ہے احساس کی شدت، وارفتگی اور کیفیت کو خیال کی ندرت اور تہہ داری سے ملا کر شعری تجربے میں ڈھالنے کی ریاضت، جسے جذبی نے اپنی خصوصیت بنا لیا۔ جذبی کے دور میں بھی غزل گوئی خاصی مقبول تھی لیکن اکثر غزل گو شعراء نے بھی غزل کی مقبولیت کا راز یا تو انداز بیان کے پیرائے میں یا ریزہ گوئی میں ڈھونڈا تھا، یا محض تاثرات کی مختلف ذرائع اور رسائل سے آرائش و زیبائش میں۔ جذبی نے غزل کی پنہائی اور دروں بینی کو نظموں تک پہنچا دیا اور پوری شاعری پر محیط کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظموں میں غزل کی امیجری اور در و بست نہ ہونے کے باوجود کیفیت اور نظامِ فکر کا خاصہ گتھا ہوا انداز ہے جو غزل کے ساتھ مخصوص سمجھا جاتا ہے۔ یہ ارتکاز جذبے اور فکر کے ملاپ سے پیدا ہوتا ہے اور غزل اور نظم، دونوں کے فنی سنگم کی کیفیت فراہم کرتا ہے۔

غزل اور نظم کی اصطلاحیں اپنی سہولت کے لئے تنقید نے گڑھ لی ہیں، لیکن شعریت ہزار گونہ طور طریقوں سے خود کو ظاہر کرتی ہے اور اس قسم کی تمام صنفی خصوصیات اور اصطلاحوں کو بے معنی کر دیتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ غزل کی سی گھلاوٹ، دل دوز اشاروں میں بات کہنے کا بلیغ انداز اور دل پر گزرتی ہوئی واردات کی بے ساختگی کو نظم کی خصوصیت بنا دینا جذبی کے معاصرین اور ان کے بعد آنے والوں میں بہت کم ہی برت سکے ہیں۔ لیکن یہی وہ روایت ہے جس کی داغ بیل ڈالنے والوں میں جذبی کا نام سرفہرست ہے اور اس کے لئے صحیح لفظ تغزل نہیں، شعریت ہے۔

اس شعریت کو دل سے اٹھنے والی آواز اور پوری شخصیت میں سرایت کر جانے والی گونج کا مرتبہ دینے کے لئے نہ صرف وقت اور سلیقہ درکار ہے، بلکہ لفظوں کے مزاج کی پہچان اور اسے جذبے اور فکر سے ہم آہنگ کرنے کا عمل بھی ضروری ہے۔ جتنی آسانی سے اور جس قدر سہولت سے یہ بات کہہ دی گئی، اس سے کہیں زیادہ دشوار ہے یہ کام۔ اسی لئے جذبی کم گو ہیں اور ہر ہر لفظ اور اس کی موسیقی اور مناسبت پر غور و فکر کرنے پر بہت وقت صرف کرتے ہیں اور یہی آہنگ ان کی شعری خصوصیت بن گیا ہے۔ اس کی تشریح اگر ممکن بھی ہو تو بھی بہت تفصیل طلب ہے، جس کی یہاں گنجائش نہیں۔ صرف ایک آدھ مثال سے وضاحت ممکن ہے......

ہر لحظہ تازہ تازہ بلاؤں کا سامنا   نا آزمودہ کار کی جرأت کہاں سے لائیں

......اس شعر میں لمحہ کے بجائے لحظہ کا انتخاب صوتی اعتبار سے 'تازہ تازہ' میں 'ز' کی آواز سے ہم آہنگ ہوکر موسیقی کے احساس کو دوبالا کرتا ہے اور روانی میں بھی اضافہ کرتا ہے۔

اس طرح مختلف مگر مماثل ٹکڑوں سے کیفیت پیدا کرنے کا ہنر وہ بار بار برتتے ہیں اور اس سے نئی کیفیت پیدا کرتے ہیں......

کوچۂ یار میں اب جانے گزر ہو کہ نہ ہو
وہی وحشت، وہی سودا، وہی سر ہو کہ نہ ہو

جذبی کی شاعری میں یہی گمشدگی، یہی خود کلامی کی کیفیت تقریباً ہر کامیاب نظم یا غزل میں نمایاں ہے۔ خارجی کیفیات کا بیان بھی کرتے ہیں تو بھی یہ انداز کسی نہ کسی شکل میں قائم رہتا ہے۔

غور کریں تو جذبی کی شاعری کو تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے دور میں داخلی کیفیات کا عمل دخل زیادہ نمایاں ہے۔ قنوطی رنگ و آہنگ بھی کسی قدر غالب ہے۔ شاعری میں ازخود رفتگی بھی ہے اور ذاتی وابستگیوں کی آواز بھی۔ فانی اور اپنے اُستادانِ فن صادق اور حامد کی اس ہدایت پر عمل بھی برملا ہوا ہے کہ تجربے کا زندگی سے کیا (براہ راست یا بالواسطہ) تعلق ہے؟ (بحوالہ نقوش، لاہور، شخصیات نمبر، اکتوبر ۱۹۵۶ء، ص: ۱۴۶)۔ ذاتی تجربے کو الفاظ اور لہجے کے مناسب اور موزوں انتخاب کے ساتھ نظم کرنے کا سلیقہ یہیں سے آیا ہے۔ قدمانے اسے صفاتے گفتگو سے تعبیر کیا تھا اور شعر میں جب ایسی کیفیت پیدا ہو جائے کہ وہ بے ساختہ اظہار کے درجے تک پہنچ جائے تو یہ شعری دروبست کا کمال ہے۔ جذبی کے ہاں اس کمال کے نمونے اکثر و بیشتر ملیں گے اور یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار میں وجد آفریں کیفیت ان کے معاصرین کے مقابلے میں اکثر سے زیادہ ہے۔

پہلا دور حامد شاہجہانپوری اور ان کے اپنے جذب روؤں کی رہبری میں مکمل ہوا۔ بعد کے زمانے میں جب ذرا دل ٹھہرا اور اسلوب میں بھی زیادہ پختگی آئی تو ایک طرف تو سماجی مسائل کے نقوش گہرے ہوئے، اور دوسری طرف فنی بالیدگی بھی آئی۔ مصرعوں پر صیقل گری بھی مشق بھی ہوئی۔ شاید اسی زمانے میں واردات قلبی بھی درپیش ہوئے اور ان کو نظموں، غزلوں میں ڈھالتے ہوئے فنی نزاکتیں بھی سامنے آئیں (مثلاً "طوائف"، "میرے سوا"، اور "گزرے گی یوں ہی اب تو اے دل"، "اب ان کے یہاں ہم کیا جائیں" جیسی غزلیں)۔ تیسرے دور میں جب فیض کی غزلیں ادبی فضا پر چھائی ہوئی تھیں تو جذبی نے ان کا اثر اپنایا اور 'چلو تلاش گل ولالہ و سمن میں چلیں' اور 'جاگ اے نسیم خندۂ گلشن قریب ہے' جیسی غزلیں کہیں۔

فنی اعتبار سے جذبی کے فن پر مختلف اساتذہ کے رنگ کے اثرات ملتے ہیں۔ مگر اس کے

باوجود ان سب پر ان کا اپنا ذاتی رنگ و آہنگ ہی غالب نظر آتا ہے اور یہ غالب رنگ و آہنگ ان کے اپنے احساس اور جذبے ہی سے عبارت نہیں، لفظیات اور مرکبات کے آئین و آداب سے بھی عبارت ہے۔ جذبی کی غزلوں اور نظموں میں حتیٰ الامکان حشو وز واید اور غیر ضروری تکرار سے (سوائے چند استثنائی صورتوں کے) پرہیز ملے گا اور یہی ان کے کلام میں گٹھاؤ اور ارتکاز کا راز ہے۔ وہ جب تک بھی الفاظ کی آوازوں میں ایک آرکسٹرائی تنظیم یا صوتی وحدت اور تاثراتی ہم آہنگی پیدا نہیں کر لیتے، مطمئن نہیں ہوتے۔

بلاشبہ ان کی طویل غزلوں میں اور دو ایک نظموں میں یہ التزام قائم رہ سکا ہے اور باوجود تمام احتیاط کے، پڑھنے والے پر یکسانیت کا احساس خود نظم یا غزل کے تاثر کو مجروح کر دیتا ہے، مگر ایسی مثالیں کم ہیں۔ وجہ یہ بھی ہے کہ جذبی کے نزدیک بنیادی لہجہ داخلی ہے اور جب تک یہ داخلی لہجہ وجود آفریں نہ ہو، وہ شعر کو محفلوں میں پڑھا جانے یا رسالوں میں چھپنے کی اجازت نہیں دیتے۔ لیکن پھر بھی بعض جگہ ایسی فروگزاشتیں ہوئی ہیں (مثلاً آزاد، بیزار نگاہیں، تو ہم، اے کاش، جیسی نظموں میں، یا ''دل میں کچھ سوز تمنا کے نشاں ملتے ہیں'' جیسی غزلوں میں)۔ بہ ایں ہمہ گھلاوٹ اور نرمی (بلکہ فراق صاحب کے لفظوں میں نرماہٹ) جذبی کی شاعری کی پہچان ہے۔ یہ وہ کیفیت ہے جسے میر کے لفظوں میں اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے......

عشق بن یہ ادب نہیں آتا

اور جو شاعرانہ نرمی اور خود سپردگی جذبی کی شاعری حب وطن یا انسانیت کے درد و غم سے تصادمت کے سلسلے میں آئی ہے، وہ بھی اسی عشقیہ خود سپردگی کی توسیع کہی جاسکتی ہے۔

عشق کے جذبی کے ہاں بھی کئی روپ ہیں۔ مگر جو اُن کی شاعری میں ظاہر ہوئے ہیں، ان میں ضبط و نظم بھی ہے اور صبر و تحمل بھی۔ وہ عشق کے ہاتھوں نہ تو رسوا اور خراب ہونے کو تیار ہیں (گزرے گی یوں ہی اب تو اے دل، اب ان کے یہاں ہم کیا جائیں) اور نہ اپنے غم میں کسی اور کو شریک کرنے پر آمادہ ہیں۔ ان عشقیہ کیفیات میں وہ ان منزلوں سے بھی گزرے ہیں......

تو گرا دے گی مجھے اپنی نظر سے ورنہ
ترے قدموں پہ تو سجدہ بھی روا ہے مجھ کو

اسی نظم کا عنوان گو ''طوائف'' ہے، مگر اس والہانہ کیفیت سے طوائف کا کوئی لازمی رشتہ نہیں ہے۔ یہ اور بات ہے اس نظم میں طوائف ہی مخاطب ٹھہری ہے۔ عشق کی ان تصویروں سے انہوں نے آئینہ خانہ سجایا ہے۔ ان میں سے ہر تصویر کے پیچھے داستان ہے جو صرف اشاروں میں بیان ہوئی ہے......

تند آہوں کے دبانے میں وہ سینے کا ابھار
ایک یوں ہی سے تلاطم کے سوا کچھ بھی نہ تھا

(توہم)

کتنے بے خواب حسینوں کی تسلی کے لئے
بند ہوتی ہوئی آنکھوں کے سلام آئیں گے
تشنگی پینے پہ مجبور کرے یا نہ کرے
زہر آلود ابھی سینکڑوں جام آئیں گے

(منزل تک)

تو ہی بتلا کہ بھلا میرے سوا دنیا میں
کون سمجھے گا ان آنکھوں کے تبسم کا گداز

(میرے سوا)

گزرے گی یوں ہی اب تو اے دل اب ان کے یہاں ہم کیا جائیں
اقرار کی آس رہے کب تک، انکار سے کب تک گھبرائیں

(غزل)

تیری خاموش وفاؤں کا صلہ کیا ہوگا
میرے ناکردہ گناہوں کی سزا کیا ہوگی

(آزار)

غرض عشق یہاں ایک پاکیزہ مگر روح فرسا لگاؤ ہے۔ شاید یک طرفہ، مگر نہایت پُر آشوب، جس نے دردمندی کو جنم تو دیا مگر اس کا تریاق فراہم نہ کرسکا۔ جذبی کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنی شخصیت کو اس بحران سے بچالے گئے اور اس جاں کاہ تجربے کے صرف زندہ رکھنے والے اثرات ہی کو اختیار کرنے میں کامیاب ہوئے، اس شکست وریخت کے عمل میں ان کی شاعری سوز و ساز آرزو کے نئے نغموں سے البتہ روشناس ہوئی جن کے سلسلے انہوں نے آشوب روزگار سے ملا دیے اور وہ اس کیفیت تک جا پہنچے......

یہ دل کا داغ جو چمکے تو کیسی تاریکی
اسی گھٹا میں چلیں ہم اسی گہن میں چلیں

رنج والم کو یہ زندگی آموزی بخشنا اور پھر اس کا فنکارانہ اظہار جس میں نہ تو پند ناصح کا شور ہو اور نہ مریضانہ داخلیت کی شکست خوردگی۔ یہی جذبی کا کمال فن ہے۔

جذبی کے فن کی یہی حدود بھی ہیں۔ وہ ان سے آگے نہیں بڑھتے۔ وہ صرف اپنی ذات کے احساسات و مشاہدات کے ذریعے ہی زندگی کو سمجھنے اور پہچاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ دوسروں کے کہنے، سننے یا خطابت و نصائح کو ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ترقی پسند شاعری کے بدترین دور میں بھی انہوں نے دوسروں کی رہبری سے زیادہ خود اپنے احساس وادراک ہی کی رہبری قبول کی اور اس راہ میں اتنے آگے تک گئے کہ سردار جعفری کا سخت لہجے والا خط بھی ان کے نام رسالہ ''شاہراہ'' میں چھپا اور خود علی گڑھ میں خام ترقی پسندوں نے ان پر یلغار بھی کی۔ مگر ان کی استقامت میں فرق نہیں آیا کہ ان کا ایقان ان کے اپنے مشاہدے پر قائم تھا، سنی سنائی باتوں پر وہ کم ایمان لاتے ہیں۔

اسی لئے ان کی دنیا کسی قدر محدود سہی، مگر ہے ان کی اپنی۔ کسی مغربی فنکار نے اپنی بیوی کے بارے میں (یا ممکن ہے اپنی مصوری کے بارے میں) کہا تھا: "A Little But My Own" وہی جملہ بڑے فخر و انبساط کے ساتھ جذبی اپنی شاعری کے بارے میں دہرا سکتے ہیں۔ ستاروں پر کمندیں ڈالنے کے وہ دعوے دار نہیں، مگر جو شعر بھی انہوں نے کہا ان کا اپنا ہی ہے اور اُس پر ان کی شخصیت کی چھاپ موجود ہے۔

شاید جذبی کے بارے میں سب سے کھری بات یہی ہے کہ کبھی انہوں نے کسی منبر پر کھڑے ہو کر اپنا قد بلند کرنے کی کوشش نہیں کی، نہ کسی کی تقلید میں اتنی دور تک گئے کہ خود اپنی راہ بھول جائیں، نہ کسی آئینے میں اپنا عکس دیکھ کر اپنے آپ کو فراموش کیا، نہ کبھی دوسرے کے قد سے اپنا قد ناپنے کے مرض میں مبتلا ہوئے۔ وہ جیسے ہیں، ویسے ہی رہنا چاہتے ہیں۔ انہیں کوئی بخشا ہوا لبادہ قبول نہیں اور کیا یہ بڑی بات نہیں ہے۔ آخر میں رہ جاتا ہے کام...... جذبی کے یہاں ملائمت، نرمی اور لہجے کی شائستگی کے سراغ، کہ اس کے بغیر جذبی پر ساری قلم فرسائی بیکار ہے۔

سوز و ساز، نرمی و شائستگی کے الفاظ اور ان کی مثالیں اردو شاعری کے لئے انوکھی اور نرالی نہیں ہیں۔ مگر جذبی کے ہاں لہجے کی اس ملایمت بھرے سوز کا انداز کچھ اور ہے۔ یہی ان کے مزاج کی نشان دہی کرتا ہے۔ یہ انداز سب سے زیادہ نمایاں ہے ان کی نظم ''موت'' میں، یا ان کی غزلوں کے اس قسم کے اشعار میں......

جاگ اے نسیم خندۂ گلشن قریب ہے
اٹھ اے شکستہ بال نشیمن قریب ہے

خطاب تو نسیم سے ہے مگر کیفیت خود کلامی کی سی ہے اور گو اس میں تشبیہات خندۂ گلشن کی ہے، مگر اس کے پیچھے درد و غم کی پوری داستان صرف شکستہ بال کے لفظوں میں بیان ہوگئی ہے۔ اب

اس شکستہ بال کے لئے نشیمن میں کیا رکھا ہوگا اور خندۂ گلشن کس کس طرح اس کی یادوں کے زخموں کو کریدے گا اور کس کس طرح اذیتوں کا اضافہ کرے گا۔ یہ سب مضمرات کے سپرد کر دیا گیا ہے۔

''موت'' ان کے طرز خاص کی نظم ہے۔ قنوطیت میں فانی کا سا انداز اور نظم میں محرومی، مایوسی، خواہشِ مرگ...... غرض وہ سب باتیں جو فانی کے نام سے پہچانی جاتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ربط و ترتیب میں وہ گٹھاؤ اور اہتمام (گو دو چار جگہ اس میں ذرا خلل پڑا ہے۔) یہ سب فانی کی وراثت کی یادگار ہیں۔ مگر یہاں جذبی نے قیام نہیں کیا۔ انہوں نے قنوط و یاس کے بجائے صحت مند تشکیک کو اپنایا۔ وہ یاس پرست نہیں لیکن اس وقت تک خواہ مخواہ امیدوار حوصلے کے گیت گانے کو تیار نہیں ہوتے جب تک شک و شبہ کی گنجائش باقی رہے۔

اس اعتبار سے وہ فانی سے بہت کچھ فکر و فن کے اعتبار سے حاصل تو کرتے ہیں لیکن محض یاس و قنوط پر شاعری کو محدود نہیں کرتے۔ اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری کو محض داخلی احساسات سے آگے بڑھا کر قومی، ملکی بلکہ بین الاقوامی مسائل تک وسعت دی مگر ان کا بیان کرنے کے بجائے ان کے پیدا شدہ اثرات و مشاہدات کو نظم کیا اور نظم کرتے وقت بھی شعریت کے آئین و آداب ہی کو نہیں رموز و علایم کو بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ مثلاً یہ شعر دیکھئے......

ان بجلیوں کی چشمک باہم تو دیکھ لیں
جن بجلیوں سے اپنا نشیمن قریب ہے

یہاں اشارہ برطانیہ اور امریکہ کی حکومتوں کی چشمک باہم کی طرف ہے جو اس وقت پسماندہ ممالک کو اپنے جال میں پھنسانے کے لئے چل رہی تھیں اور جن کا انجام پاکستان میں لیاقت علی خاں کی موت کی شکل میں سامنے آیا۔

خیر، یہ تو ایک ضمنی سی بات ہے۔ اس شعری انداز بیان کی سب سے کامیاب اور بلیغ مثال ان کی نظم ''نیا سورج'' ہے۔ یہ نظم ہندوستان کی آزادی پر لکھی گئی ہے اور صاف اشارہ ہے آزادی کی حد بندی کی طرف۔ اس طرز کی دو ہی نظمیں اس زمانے میں مشہور ہوئیں۔ ایک فیض کی نظم ''یہ داغ داغ اجالا'' اور دوسری جذبی کی ''نیا سورج''، جس میں علامتی انداز میں اس وقت ہندوستان کی آزادی کے تمام تصورات کو ایک نئے رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔

جذبی کی عام روش سے ہٹ کر اپنے ذاتی احساس ادراک کو رہنما بنانے کی یہ کوشش ان کی انفرادیت کی دلیل تو ہے، لیکن اس سے زیادہ اہم ہے اس نظم کے انداز بیان کی نرمی اور دردمندی۔ وہ بھی اس وقت جبکہ پورا ملک آزادی پانے کی خوشی میں شادمانی کے گیت گا رہا

تھا۔ خشونت کی جگہ نرمی اور شائستگی کے لہجہ کو قائم رکھنا جذبی کے مزاج کا کمال ہے......

اری او نئی شان کے میرے سورج
تری آب میں اور بھی تاب آئے
ترے پاس ایسی بھی کوئی کرن ہے
جو ایسے درختوں میں بھی راہ پائے
جو ٹھٹھرے ہوؤں کو جو سہمے ہوؤں کو
حرات بھی بخشے گلے بھی لگائے

یہی رنگ و آہنگ، نرمی اور کھرے داخلی بلکہ ذاتی احساس کا ان کی دو نظموں میں نئے انداز سے راہ پا گیا ہے۔ ایک ''میری شاعری اور نقاد'' میں اور دوسرے مجاز کے مرثیے میں۔ گو دونوں نظموں میں انداز مختلف ہے۔ ''میری شاعری اور نقاد'' میں شکوہ ہے تو یہ کہ......

نہ تو دیوانے کا دامان دریدہ ہی ملا
نہ تو مے خوار کو اک قطرۂ صہبا ہی ملا
بدلیاں چھٹنے نہ پائی تھیں کہ پھر چھانے لگیں
بجلیاں سر پہ اسی طور سے لہرانے لگیں

اور یہ فریاد محض جذبی کے ذاتی دکھ درد کا اظہار نہیں، آج کے ہر دردمند دل کا احساس ہے کہ آزادی کے باون سال گزر جانے کے بعد ہر خواب ادھورا ہے اور ہر ارمان نا آسودہ!

مجاز پر مرثیے کا اختتام بھی اسی قسم کے نا آسودہ ارمانوں کے ماتم پر ہوتا ہے۔ جن کے لئے مجاز کی زندگی گویا صرف ہوئی......

عیش امروز، تجھے روح طرب کی سوگند
دل انساں کے کہن سال ملالوں کو تو دیکھ
دل صد پارۂ مظلوم کی آہوں میں تو ڈھونڈ
شہر پاروں کی غضبناک نگاہوں میں تو دیکھ
اے شب تیرہ و تاریک کے مارے جذبی
صبح ناپید کے موہوم اجالوں میں تو دیکھ

حالات اور واقعات کے اسی وسیع تر تناظر پر جذبی اپنے شعری احساس کی بنیاد رکھتے ہیں کہ جب حالات اور واقعات کی یادیں دھندلا جاتی ہیں تب بھی ان سے پیدا شدہ یہ احساسات جادو جگاتے رہتے ہیں۔

میرٹھ سے داناپور (بہار) منتقل ہونے والے اور پھر وہاں سے آکر لکھنؤ آکر آباد ہونے والے ڈاکٹر عبدالغفور مطیع کی بدولت ادبی اور شعری ذوق تو وراثت میں ملا تھا۔ ادبی اس لئے بھی کہ دادا کا ارادہ لغت مرتب کرنے کا تھا اور جذبی کو بچپن ہی سے اچھے اشعار حفظ کرنے کی خدمت سپرد کی گئی تھی۔ پھوپی کی شادی ہوئی رزاق الخیری سے، جو دہلی کے مشہور ادیب راشدالخیری کے صاحبزادے تھے۔ جذبی صادق دہلوی کے شاگرد حامد شاہجہانپوری کے پڑوسی تھے۔ لہٰذا انہیں کی شاگردی میں شعر گوئی بھی جذبی نے شروع کردی اور ملال تخلص اختیار کیا۔ سینٹ جانس کالج، آگرہ میں مجاز کے ہم جماعت ہوئے۔ دونوں سائنس کے طالب علم تھے۔ یہیں فانی سے میکش اکبرآبادی کے ہاں ملاقاتیں ہوئیں اور رنگ طبیعت انہیں سے متاثر ہوا۔ پھر ۱۹۳۳ء میں ملال سے جذبی ہوئے اور پھر کچھ غم عشق اور کچھ افتاد طبع کی خاطر، کچھ سوتیلی ماں کی بدولت والد سے خفا ہوکر گھر سے نکلے اور جھانسی اور پھر دہلی اور بمبئی تک پہنچے۔ فلموں میں بھی قسمت آزمائی کی، اسکولوں میں بھی پڑھایا۔ دہلی میں رسالہ "آجکل (اردو)" میں بھی نائب مدیر رہے۔ آخرکار علی گڑھ آئے۔ یہاں رہ کر ایم۔اے۔، پی۔ایچ۔ڈی۔ کیا اور یہیں شعبۂ اردو میں پہلے لیکچرار اور پھر ریڈر مقرر ہوئے۔ (بحوالہ مضمون مطبوعہ نقوش، لاہور، شخصیات نمبر۲)

مگر شاعر جذبی کی دنیا ہی کچھ اور تھی۔ جو دل پر گزری وہ شاعری میں پوری دیانت داری اور محنت سے کہا اور اس کی فکر نہ کی کہ اس کلام میں کتنی عظمت ہے یا کتنی بلندی ہے۔ شاعری ان کے لئے کوئی پیشہ نہیں ہے۔ اظہار ذات ہے۔ جیسی بھی ذات ہو، اس کا دیانتدارانہ اظہار بلاتصنع کے، بلا کوئی مصنوعی چہرہ لگائے ہو۔

بعد میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی ملازمت سے ریٹائر ہوکر علی گڑھ ہی میں اپنا مکان بنوالیا تھا۔ وہیں رہتے تھے اور تقریباً گوشہ نشین تھے۔ یقین ہے کہ اس گوشہ نشینی میں بھی بہت کچھ غزلیں اور نظمیں کہی ہوں گی اور بقول مشتاق احمد یوسفی "پال میں لگادی ہوں گی"، کہ ذرا پک جائیں تو پھر دیکھیں گے۔ ان کی شاعری ہی نہیں، زندگی کے بہت سے ایسے واقعات ہیں جنہیں قلم لکھنے کے لئے مچل رہا ہے۔ مگر اس وقت اس کا محل نہیں۔ آخر شاعر کی شخصیت کے کئی روپ ہوتے ہیں اور ان سے انصاف کرنا آسان نہیں۔ ان کا شعر کی ان کی نذر ہے......

رواں دواں یوں ہی اے ننھی بوندیوں کے ابر
کہ اس دیار میں اجڑے چمن کچھ اور بھی ہیں

OO

اُردو اکادمی دہلی

(دہلی سرکار)

اردو اکادمی، دہلی اپنی گورننگ کونسل کے مشوروں سے

مختلف جہات میں اردو کی ترویج وترقی کے لیے درج ذیل خدمات انجام دے رہی ہے

● دو ماہنامہ رسائل ''ایوانِ اُردو'' اور ''امنگ'' کی اشاعت ● کتابوں کی اشاعت ● مسودات پر مالی اعانت ● کتابوں کی نمائش ● دہلی کے اردو پی۔ایچ۔ڈی اسکالرز اور ایم۔فل کے طلباء کو اسکالر شپ ● ریسرچ اسکالرز کو ٹائپنگ / کمپوزنگ کے لیے مالی اعانت ● سمینار اور مذاکرے ● نئے پرانے چراغ ● اُردو ڈراما فیسٹول ● دہلی کی فعال ادبی وثقافتی انجمنوں کے اشتراک سے پروگراموں کا انعقاد ● اردو ٹاپرز طلبا کو انعامات ● تعلیمی مقابلے اور امنگ پینٹنگ مقابلہ ● اُردو سرٹیفکیٹ کورس اور اُردو ڈپلومہ کورس ● کوچنگ کلاسیز کا اہتمام ● اردو لٹریسی سینٹرز ● سرکاری اسکولوں کو اساتذہ کی فراہمی ● دارا شکوہ لائبریری ● اخبارات کے گوشے ● اردو اسکولوں کی لائبریریوں کو رسائل و کتابوں کی فراہمی ● چھوٹے اردو اخبارات و رسائل کو اشتہارات ● کتابت اور اردو ٹائپ شارٹ ہینڈ مراکز ● اسکولوں میں درس وتدریس کے لیے جزو وقتی اساتذہ کی فراہمی ● ادبی شخصیات کے لیے سالانہ ایوارڈز ● کتابوں پر انعامات اور ناشرین کو منشی نول کشور انعام ● بزرگ مصنفین/شعراء/صحافیوں کو ماہانہ مالی اعانت ● مشاعرے وشعری نشستیں

المشتہر

مرغوب حیدر عابدی (سکریٹری)

اردو اکادمی کا نیا پتہ

اردو اکادمی، دہلی، سی۔پی۔او۔بلڈنگ، کشمیری گیٹ، دہلی ۱۱۰۰۰۶

PH:23863729,23865436,23863858,23863566,23863697 Fax:23863773

E-Mail:Secyuraca@nic.in

معین احسن جذبی: شخص اور شاعر

یادش بخیر...... ۱۹۵۵ء میں جب میں نے ڈاکٹریٹ کی غرض سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لیا تو وہاں کی تین شخصیتیں میرے لئے خاص کشش کا باعث تھیں۔ یعنی جذبی صاحب، اختر انصاری (مرحوم) اور استاد محترم رشید احمد صدیقی (مرحوم)۔ رشید صاحب میرے نگراں مقرر ہوئے اور اس طرح انہیں قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا شرف حاصل ہوا۔ اختر انصاری بڑی معصوم، بے لاگ اور انوکھی شخصیت کے مالک تھے۔ علی گڑھ آنے سے پہلے ان کی کتاب ''آبگینے'' اور جذبی کی ''فروزاں'' فیض کی ''نقش فریادی'' کی طرح میرے لئے آسمانی صحیفوں کی حیثیت رکھتی تھیں۔ ''فروزاں'' کی شاعری میں یاسیت آمیز اداسی اور محزونی کا جو گہرا رنگ تھا، اس سے میں نے ان کی شخصیت کا جو نقش بنایا تھا، وہ دو تین ملاقاتوں میں منہدم ہوگیا۔ میں نے سوچا تھا کہ وہ اداس، خیالوں میں غرق، مضمحل اور سوئے سوئے سے انسان ہوں گے۔ لیکن میں نے ان کو نہایت متحرک، شگفتہ رو اور سیماب صفت پایا۔ کم بولتے، مگر بے محابا انداز سے بولتے اور بات بات پر مزاحیہ فقرے کسنے میں بھی تامل نہ کرتے۔ خواہ مخواہ نہ کسی سے مرعوب ہوتے نہ کسی سے مل کر نمائشی جوش اور خوشی کا اظہار کرتے۔ پہلی بار ڈاکٹر محمد حسن صاحب نے جب ان سے متعارف کرایا اور کہا کہ یہ پریم چند پر کام کر رہے ہیں، تو کسی قدر بے نیازی لیکن روشن آنکھوں سے میرے سراپے کا جائزہ لیا۔ گویا دیکھ رہے ہوں کہ میں اس موضوع کے ساتھ انصاف کرنے کی صلاحیت رکھتا ہوں یا نہیں۔ پھر تیزی سے بولے، ''پریم چند کیوں؟ کوئی اور موضوع لیتے۔'' میں نے عرض کیا، سب لوگ شاعری پر کام کرتے ہیں۔ فکشن کو نظر انداز کیا جا رہا ہے، اور پریم چند تو ہمارے بہت قد آور ادیب ہیں۔ یہ سن کر کچھ متاثر ہوئے۔ لیکن ان ابتدائی ملاقاتوں میں، میں ان سے متاثر نہیں ہو سکا، اور ''فروزاں'' کے مطالعے سے ان کی شخصبت کا جو پیکر بنا تھا، وہ بھی تحلیل ہوگیا۔ لیکن جب علی گڑھ کے کیفوں، بے تکلف محفلوں اور

مجلسوں میں ان سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا تو جذبی صاحب کی البیلی شخصیت کے باطنی خط وخال ابھر کر سامنے آئے۔ دور سے دیکھنے والوں کو بیشک وہ کچھ پُر اسرار، کچھ بیزار اور کم آمیز نظر آتے ہیں اور سچ بھی ہے کہ وہ بڑے آدمیوں کی رفاقت اور پُر تکلف محفلوں سے ارادی طور پر کتراتے تھے، لیکن اپنے حلقے کے دوستوں اور نوجوانوں میں آسانی سے گھل مل جاتے۔ ہر موضوع پر کھل کر باتیں کرتے۔ لطیفے سناتے، مجاز اور دوسرے دوستوں کے ساتھ آوارگی کے جو دن انہوں نے گزارے تھے، اس کی تفصیل ایسی محاکاتی دلکشی سے بیان کرتے کہ تصویر آنکھوں میں پھر جاتی۔ دہلی کے کئی لالہ رخوں کے کاشانوں کی ہم نے ان کے اور مجاز کے ساتھ سیر کی ہے۔ ان کی ذات میں ہم نے مصلحت اندیشی اور ریاکاری کا شائبہ بھی نہ پایا۔ دراصل یہ ان کی آزاد مشربی اور قلندرانہ شان تھی، جو ہر ایک کا دل موہ لیتی۔ وہ اپنے دوستوں، نیازمندوں اور شاگردوں کے درمیان بیٹھ کر یہ بالکل بھول جاتے ہیں کہ وہ ملک کے صف اوّل کے شاعر اور دانشور ہیں۔ ترقی پسند شعری روایت کے ممتاز معماروں میں سے ایک ہیں۔

جذبی صاحب بے تکلف محفلوں میں ہی کھلتے۔ ان کے وجود پر کوئی نقاب نظر نہیں آتی۔ کبھی کبھی نوجوانوں کو ٹوک دیتے، ڈانٹ بھی دیتے۔ میں نے بھی غلط محاورے اور تلفظ پر کتنی بار ان کی ڈانٹ کھائی ہے۔ لیکن ان کی تلقین اور تنبیہہ میں اتنی شیرینی اور محبت ہوتی کہ کبھی کوئی بُرا نہ مانتا۔ وہ بعض دوسرے نامور ادیبوں کی طرح اپنی شخصیت اور علمیت سے مرعوب کرنے کی کوشش نہیں کرتے، بلکہ ان کی محبت میں اکثر محسوس بھی نہیں ہوتا کہ ہم کسی بڑے ادیب سے ہم کلام ہیں۔ اگر کسی علمی مسئلہ پر گفتگو چھڑ جاتی تو وہ دو تین جملوں میں نہایت رواروی میں اپنی رائے دے کر بے نیاز ہو جاتے۔ ان کی اس ظاہری سادگی سے بعض لوگوں کو گمان ہوتا کہ وہ کھلنڈرے قسم کے انسان ہیں۔ لیکن مجھے یہ یقین کرنے میں دیر نہیں لگی کہ جذبی صاحب کی داخلی دنیا میں فکر واحساس کا جو تلاطم برپا رہتا ہے، گہرائی میں جذبات کی جو لہریں اٹھتی رہتی ہیں، ان پر ضبط اور قابو رکھنے میں انہیں غیر معمولی قدرت حاصل ہے، اور ایسا اس لئے ہے کہ وہ درد وغم اور جوش واضطراب پر سوچ کی نازک قبا ڈالے رہتے ہیں۔ ان کے وجود میں ایک ایسا الاؤ روشن ہے جس کی آنچ بھی وہ باہر آنے نہیں دیتے۔ یہ باطنی صورت حال ''فروزاں'' کی ایک غزل کے ان اشعار میں دیکھی جا سکتی ہے......

افسردگی ضبط الم آج بھی سہی
لیکن نشاط ضبط مسرت کہاں سے لائیں

ہر فتح کے غرور میں بے وجہ، بے سبب
احساس انفعال ہزیمت کہاں سے لائیں
آسودگی لطف و عنایت کے ساتھ ساتھ
دل میں دبی دبی سی قیامت کہاں سے لائیں
وہ جوش اضطراب میں کچھ سوچنے کے بعد
حیرت کہاں سے لائیں ندامت کہاں سے لائیں
ہر لحظہ تازہ بلاؤں کا سامنا
نا آزمودہ کار کی جرأت کہاں سے لائیں

یہاں بعض اشعار میں شاعر نے جن اشیاء کا ذکر کیا ہے (مثلاً دبی دبی سی قیامت) نفی کے انداز میں کیا ہے۔ وہ ایک معکوس صداقت یعنی اثبات کا پہلو رکھتی ہیں۔

اسی زمانہ میں معلوم ہوا کہ جذبی صاحب پی۔ ایچ۔ ڈی کے لئے مولانا حالی پر تحقیقی کام کر رہے ہیں۔ یہ ان کا مزاج نہیں تھا۔ لیکن دوستوں نے منصبی ضرورتوں کا واسطہ دے کر مجبور کیا تو آہستہ آہستہ انہوں نے کام شروع کر دیا۔ مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ جذبی صاحب نے حالی جیسے خشک اور بے کیف شاعر کا انتخاب کیوں کیا (اس زمانہ میں حالی کے بارے میں میری رائے یہی تھی)؟ اس وقت میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔ بعد میں جب میں نے حالی کو ذرا سنجیدگی سے پڑھا تو محسوس ہوا کہ جذبی صاحب کا یہ انتخاب ان کی فطری نہاد اور افتاد کے عین مطابق تھا۔ ان کا تخلیقی شعور حالی کے تصور فن سے مربوط تھا۔ حالی کی سرکش اور حقیقت پسند طبیعت نے ایک طرف روایتی مضامین اور دوسری جانب جذباتی وفور سے اجتناب کیا۔ انہوں نے غزل میں روح عصر کی ترجمانی پر زور دے کر اسے انفرادیت پسندی اور رومانیت کے حصار سے آزاد کرایا۔ انہوں نے زندگی کی سیدھی سادی لیکن سچی باتوں کو حسن بیان کے سہارے دلفریب بنا کر پیش کرنے پر اصرار کیا۔ جذبی صاحب کے شعری لہجے میں بھی ابتدا ہی سے کلاسیکی ضبط و نظم کے ساتھ ساتھ تخلیقی اظہار کی یہی سادگی، صداقت اور نرمی ملتی ہے۔ اپنے معاصرین جوش ملیح آبادی، اسرار الحق مجاز، اختر شیرانی اور فیض سے جذبی صاحب کا شعری لہجہ اسی لئے مختلف ہے کہ ان شعراء کی طرح انہوں نے تخیل کی رنگینی اور جذبے کی بلند آہنگی کا سہارا نہیں لیا، اس لئے بھی کہ یہ سہارے زندگی کے تلخ و شیریں تجربات کو اس طرح بے جا طور پر Glorify کر کے پیش کرتے ہیں کہ ان کی اصل صورت مسخ اور دھار کند ہو جاتی ہے۔ حالی کو بھی یہ گوارا نہیں تھا۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان کی غزل میں تخلیقی عناصر کم ہیں یا

ان کے اشعار ایمائی اظہار کے کیف ونشاط سے خالی ہیں۔
حالی کے چند اشعار دیکھئے......

عشق سنتے تھے جسے ہم وہ یہی ہے شاید
خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا

اس کے جاتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت

دھوم تھی اپنی پارسائی کی
کی بھی اور کس سے آشنائی کی

ڈر ہے دلوں کے ساتھ امیدیں بھی پس نہ جائیں
اے آسیائے گردش لیل و نہار، بس

یاران تیزگام نے محمل کو جا لیا
ہم محو نالۂ جرسِ کارواں رہے

اس طرح کے اشعار غزل میں جس نئی شعری حسیت کی آمد کا مژدہ تھے، اس کا نکھرا ہوا اظہار حسرت اور فانی کے بعد جذبی ہی کے کلام میں ملتا ہے۔ ان کے یہاں ایسا تغزل ہے جس سے کان مانوس ہیں، لیکن جس میں نئے سروں اور نئے نغموں کا آہنگ بھی سنائی دیتا ہے۔ اس میں جذبے کی مستی اور احساس وآگہی کی شائستگی، حسن کی ایک نئی دنیا خلق کرتے ہیں۔ جذبی ہی کا شعر ہے......

تری آنکھوں میں کچھ ہو یا ترے ساغر میں ہو ساقی
میں اتنا جانتا ہوں تجھ سے رنگ انجمن بدلا

جذبی کے اشعار حقیقت شعاری، درد مندی اور شدت احساس کے ایسے پیکر ہیں جو غزل میں خاموشی سے ایک نئے جمالیاتی کردار کی تخم ریزی کر رہے تھے۔ ان کی تعقل دوستی اور جذبہ کی کفایت شعر میں ایک نئے احساس تغزل کو سموتی ہے، لیکن اسے چھلکنے نہیں دیتی۔ وہ عشق جنوں ساماں کی واردات ہوں یا ماحول کی ناہمواریوں کے خلاف احتجاج، جذبی اپنے لہجے کو بے کیفی اور درشتی، دونوں سے محفوظ رکھتے ہیں۔ یہی نہیں، وہ اپنے دل کے سوز کو شعر کے نازک آبگینے میں اتار دیتے ہیں۔

ہم نے غم کے ماروں کی محفلیں بھی دیکھی ہیں
ایک غمگسار اُٹھا ایک غم گسار آیا

روشن ہوئے نہ پھر در و بام آرزو
ایک ایک اشک مہرِ درخشاں ہوا تو کیا

منزل عشق پہ یاد آئیں گے کچھ راہ کے غم
مجھ سے لپٹی ہوئی کچھ گردِ سفر بھی ہوگی

اے موج بلا ان کو بھی ذرا دو چار تھپیڑے ہلکے سے
کچھ لوگ ابھی تک ساحل سے طوفاں کا نظارہ کرتے ہیں

مجازؔ اور فیضؔ کے پہلے شعری مجموعوں کی بے پناہ مقبولیت کا سبب ان کی غزلیں نہیں، نظمیں تھیں اور بجا طور پر ان کو نظمیہ شاعری میں ترقی پسند شعری روایت کا نقطۂ آغاز کہا جا سکتا ہے۔ لیکن ''فروزاں'' میں چند معرکے کی خوبصورت نظموں کے باوجود غزلیں ہی عام کشش اور توجہ کا مرکز بنیں۔

جذبیؔ بھی فیضؔ کی طرح ایک انقلابی نظریہ سے متاثر تھے اور ایک روشن سیاسی شعور رکھتے تھے۔ لیکن نظم کی کشادہ اور کھلی فضا میں جہاں اس شعور کا اظہار آسان تھا، غزل کی اشاراتی زبان میں اتنا ہی مشکل تھا۔ جذبیؔ صاحب نے اپنی تخلیقی بصیرت سے اس مشکل کو آسان کر کے ایک نئی راہ بنائی۔ وہ 'فروزاں'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں......

''ہمارے لئے مارکسی نقطۂ نظر پیدا کرنا نہایت ضروری ہے۔ اگر ہم واقعی اپنے آپ کو ترقی پسندی کا علمبردار کہتے ہیں۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ مارکس کے نظریات کو رنگین یا پُر شوکت الفاظ میں نظم کر دیا جائے۔ ایک شاعر کی حیثیت سے ہمارے لئے جو چیز سب سے زیادہ اہم ہے وہ زندگی یا زندگی کے تجربات ہیں۔ لیکن کوئی تجربہ اس وقت تک موضوعِ سخن نہیں بن سکتا، جب تک اس میں شاعر کو جذبہ کی شدت اور احساس کی تازگی کا یقین نہ ہو جائے۔''

یہی وہ صحیح اور متوازن تخلیقی رویہ تھا، جسے جذبیؔ صاحب نے اپنی شاعری میں برتا، اور یہ کہنا شاید مبالغہ نہ ہوگا کہ ترقی پسند شعراء کی صف میں انہوں نے ہی سب سے پہلے غزل کے احتجاجی لہجے کا تعین کیا، جس کی پیروی دوسرے شعراء نے بھی کی۔ انہوں نے کلاسیکی غزل کی لفظیات کو نئے مفاہیم سے آشنا کیا۔ اس طرح کہ وہ اپنے عہد کے سیاسی سیاق و سباق میں نئی زمینی حقیقتوں کا اشاریہ بن گئی۔ اس کے شب تاب، معرکہ ہائے چمن، آہ سحر گہی، شورش حیات، در و بام آرزو، تعزیرِ درد، آسودگان، سایۂ دیوار وغیرہ غزل میں انقلابی حسیت کے دریچے کھول رہی تھیں۔ صرف چند اشعار دیکھئے......

کلی نے سر اُٹھایا یا لالۂ خونیں کفن بدلا
خزاں میں دیکھتے ہی دیکھتے رنگ چمن بدلا
ابھی سموم نے مانی کہاں نسیم سے ہار
ابھی تو معرکہ ہائے چمن کچھ اور بھی ہیں
ہر قدم آگے بڑھانے کے لئے خون کی بھینٹ
ایسے بھی اے غم دل کتنے مقام آئیں گے
مہکا نہ کوئی پھول نہ چٹکی کوئی کلی
دل خون ہو کے صرف گلستاں ہوا تو کیا
کیا تجھ کو پتہ کیا تجھ کو خبر دن رات خیالوں میں اپنے
اَے کاکل گیتی ہم تجھ کو جس طرح سنوارا کرتے ہیں
چونکیں نہ آندھیاں نہ بگولے کہیں اُٹھے
اپنا جنوں محیط بیاباں ہوا تو کیا

آخری شعر میں اس المناک حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ انقلابی طاقتوں کی جدوجہد اور ایثار وعمل کے باوجود دنیا میں وہ انقلاب نہیں آسکا، جس کا خواب شاعر نے دیکھا تھا۔

بہ حیثیت غزل گو، جذبی صاحب کا مرتبہ کسی دوسرے ترقی پسند شاعر سے کم نہیں ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ انہیں وہ ہمہ گیر شہرت نہ مل سکی جو دوسرے شعراء کے حصے میں آئی۔ اس میں ان کی گوشہ نشینی اور قلندری کے علاوہ ان کے اس الم انگریز شعری لہجے کا بھی حصہ ہے جو ترقی پسند شاعری کے رجائی انداز سے ہم آہنگ نہیں تھا۔ وہ ترقی پسندوں کے مرکز بمبئی، فلموں، بڑے اداروں اور ترقی پسندوں کے جلسوں اور مشاعروں سے بھی دور دور رہے۔ اس لئے ان کی شہرت اور مقبولیت کا دائرہ محدود رہا۔ اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ برصغیر کے ہر حلقہ، ہر مسلک اور ہر نسل کے اہل نظر نے ان کے کمال فن کی داد دی ہے۔ OO

معین احسن جذبی.........کچھ یادیں

جب کشتی ثابت و سالم تھی، ساحل کی تمنا کس کو تھی
اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنا کون کرے

یہ شعر میں نے بچپن میں سنا، جب میری عمر کوئی دس سال کی ہوگی...... میں موانہ ضلع میرٹھ میں اپنے بھائی مولوی سید ممتاز علی کے پاس رہتا تھا، اور ایک مجھ سے بڑے بھائی سید اشتیاق علی شوق بھی رہتے تھے۔ انہیں میں بھائی جان کہتا تھا۔ بھائی جان کے ایک دوست تھے نخشب جارچوی...... جو اس وقت اختر عباس اختر کہلاتے تھے، نخشب جارچوی تخلص بعد میں رکھا۔ یہ دونوں دوست اپنا کافی وقت شعر و شاعری میں گزارتے تھے۔ میں بھی ان کے پاس اٹھتا بیٹھتا تھا اور جب میرے کان میں یہ شعر پڑا تو بہت اچھا لگا...... پھر جب مطالعہ کا شوق ہوا تو معلوم ہوا یہ شعر معین احسن جذبی کا ہے، اور پہلی بار دسمبر ۱۹۴۲ء کے ایک مشاعرے میں، میں نے جذبی کو سنا۔ روبرو نہیں، بلکہ مراد آباد کے ایک مشاعرے میں جو آل انڈیا ریڈیو، دہلی سے نشر ہو رہا تھا۔

جذبی نے اس مشاعرے میں اپنی نظم...... "آزار" سنائی۔ پُر سوز آواز، ٹھہرا ٹھہرا سا مترنم لہجہ۔ ان کے ترنم میں ایک دل شکستگی کا انداز تھا، اور کل ملا کر غمگینی کا تصور ابھرتا تھا۔

وہ نظم میرے حافظے کا حصہ بن گئی۔ یہ ان کی تازہ نظم تھی۔ ان کے مجموعہ کلام "گدازِ خیال" میں اس کا سنہ تصنیف ۱۹۴۲ء ہی لکھا ہوا ہے۔

وہ دور انقلابی نظموں کا تھا۔ جوش کا ڈنکا بج رہا تھا۔ احسان دانش کی نظمیں، جن میں غریبوں کی آہیں، سسکیاں اور مزدوروں کی زندگی کی جھلکیاں ہوتی تھیں۔ مشاعروں میں گونج رہی تھیں۔ ان کی کتاب "نقیبِ فطرت" آ چکی تھی۔ ساغر نظامی اور روش صدیقی کی انقلابی نظموں پر لوگ سر دھنتے تھے۔ جذبی کی نظم ان سب سے الگ نظر آئی۔ نظم میں غزل کے لہجے کی گھلاوٹ اور سوزِ دروں کی آنچ......

کیا خبر تھی کہ ترے پھول سے بھی نازک ہونٹ
زہر میں ڈوبیں گے، کمھلائیں گے، مرجھائیں گے
کس کو معلوم تھا یہ حشر تری آنکھوں کا
نور کے سوتے بھی تاریکی میں بکھر جائیں گے
تیری خاموش وفاؤں کا صلہ کیا ہوگا
میرے ناکردہ گناہوں کی سزا کیا ہوگی
قہقہے ہوں گے اور اشکوں کی ترنم ریزی
دلِ وحشی ترے جینے کی ادا کیا ہوگی

یہ نظم جذبی کی پُرسوز آواز میں سن کر میں اس شاعر کا گرویدہ ہوگیا۔ ان دنوں ادبی رسائل میں تین شاعروں کا نام ایک ساتھ لیا جاتا تھا...... مجاز، جذبی اور جاں نثار اختر...... یہ تینوں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں طالب علمی کے زمانے میں ہی ملک بھر میں مشہور تھے، اور دلچسپ بات یہ تھی کہ رنگ سخن الگ الگ تھا...... مجاز کی ''آوارہ''، جذبی کی ''موت'' اور جاں نثار اختر کی ''گرلس کالج کی لاری''...... ان کی پہچان بن گئی تھیں۔

۱۹۴۳ء کے وسط میں، میں اپنے وطن نگینہ سے دہلی آیا۔ اس وقت تک میں بھی خاصی شاعری کرنے لگا تھا اور میری نظمیں لاہور کے ادبی رسائل ''ہمایوں''، ''ادبی دنیا''، ''شاہکار'' اور ''نیرنگ خیال'' وغیرہ میں چھپنے لگی تھیں۔ دہلی آکر ''ہارڈنگ لائبریری'' (موجودہ 'ہردیال لائبریری') میں ایک مخصوص ادبی نشست میں جذبی کو دیکھنے، ملنے اور روبرو آنے کا، کلام سننے کا اتفاق ہوا۔ بہت ہی مختصر سی نشست تھی وہ۔ قابل ذکر لوگ تھے۔ خواجہ حسن نظامی، مجاز، جذبی، نخشب جارچوی اور ہارڈنگ لائبریری کے سربراہ اور رسالہ ''ادیب'' کے ایڈیٹر فصیح الدین احمد...... جذبی نے اپنی نظم ''موت'' سنائی...... وہی پُرسوز ترنم......

اپنی سوئی ہوئی دنیا کو جگالوں تو چلوں
اپنے غم خانے میں اک دھوم مچالوں تو چلوں
اور اک جام مئے تلخ چڑھالوں تو چلوں
ابھی چلتا ہوں، ذرا خود کو سنبھالوں تو چلوں

نظم کا عنوان تو ہے ''موت''...... مگر نظم زندگی کے عزم وعمل کا پیکر معلوم ہوتی ہے۔ موت برحق ہے مگر شاعر موت سے پہلے اور بہت کچھ کرنا چاہتا ہے۔ جس کا اشارہ اس سے پہلے بند میں کیا گیا ہے۔

وہ مرا سحر، وہ اعجاز کہاں ہے لانا
میری کھوئی ہوئی آواز کہاں ہے لانا
میرا ٹوٹا ہوا وہ ساز کہاں ہے لانا
اک ذرا گیت بھی اس ساز پہ گالوں تو چلوں

جذبی کا لہجہ سب سے الگ تھا...... نہ نئے الفاظ، نہ غیر معروف تراکیب، مگر روایت کے نگارخانے سے ہی الفاظ چن کر ایسی نئی نظم اور غزل تخلیق کرنا جذبی کی بے پناہ تخلیقیت کا غماز ہے۔ جذبی ان دنوں رسالہ "آج کل" کے نائب مدیر تھے۔ بہت کم آمیز، کم سخن، اپنی شخصیت اور شاعری پر نازاں، سر کے بال کافی اڑ چکے تھے۔ چہرہ بیضاوی، رنگ گندمی، لباس سادہ، جب موڈ میں بات کرتے تو ایک مخصوص تبسم ان کے لبوں پر کھیل جاتا۔ ان دنوں جامع مسجد کے آس پاس اور اردو بازار میں بہار تھی۔ ہر کتب خانے پر ادیبوں اور شاعروں کا جم گھٹا لگا رہتا تھا۔ مگر جذبی اس ہجوم میں کبھی نظر نہیں آتے تھے۔ مجاز، کبھی کبھی آغا سرخوش قزلباش کے کتب خانہ "چمنستان" میں نظر آجاتے تھے۔ نخشب اور شکیل بدایونی بھی وہاں کبھی کبھی آبیٹھتے تھے۔ مگر جذبی کو اس بازار میں نہ دیکھا...... پھر ان سے بہت تفصیلی ملاقات ہوئی۔ دسمبر ۱۹۴۴ء میں اور وہ بھی مجاز کے ساتھ! وہ رات بہت خوبصورت تھی...... چاندنی چوک کے ایک گھر میں، میزبان تھے مجاز، اور مہمان خصوصی تھے ساغر نظامی اور ان کی بیگم ذکیہ ساغر۔ ان کی شادی کو ایک آدھ سال ہی ہوا تھا اور وہ پونا سے آئے تھے۔ ان کے علاوہ جذبی، نہال سیوہاروی اور میں۔

سورج غروب ہونے کے بعد مجاز کے کمرے میں سرد روشنی کا آفتاب طلوع ہوا، اور بقول مجاز......

عیب جو حافظ و خیام میں تھا
ہاں کچھ اس کا بھی گنہگار ہوں میں

......اور اس گناہ میں میرے اور ذکیہ ساغر کے علاوہ سب شامل تھے۔ میں خالص سوڈے اور نمکین سے شوق کر رہا تھا۔ ہر پیگ کے بعد مجاز کھلتے چلے جا رہے تھے اور ساغر کی آواز میں نئی چمک آتی جا رہی تھی۔ نہال سیوہاروی تو بے پیے ہی نشے میں رہتے تھے۔ ان کا ایک شعر ہے......

نہال کو بے پیے ہے مستی، ہے مفت الزام مئے پرستی
ہے عام اس شہر میں روایت، یہ شخص کچھ بادہ خوار سا ہے

نہال صاحب کم کم پی رہے تھے۔ جذبی کی رفتار مئے کشی میں نارمل تھی۔ وہ زیادہ نہیں بول رہے تھے۔ ہاں ان کے چہرے پر بشاشت کھل اٹھی تھی اور وہ بیچ بیچ میں ایک آدھ خوبصورت

فقرہ اچھال دیتے تھے۔

شعروشاعری کا بھی دور چلا۔ ذکیہ ساقی گری کررہی تھیں اور ساغر صاحب کو بار بار کم پینے کے لئے اشارہ کرتی تھیں۔ مگر ساغر اور مجاز اس محفل کی جان تھے۔ آخر گیارہ بجنے کے بعد کھانے کی بات کی گئی تھی اور مجاز نے سامنے کے لکشمی ریسٹورینٹ سے بریانی منگائی۔ بہت لذیذ کھانا تھا۔ سب نے جی بھر کر کھایا۔ بارہ بجے کے بعد یہ محفل برخاست ہوئی۔ ساغر تو فتح پوری کے نزدیک کورونیشن ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ وہ تو اُدھر چل دیے، اور نہال سیوہاروی، جذبی اور میں جامع مسجد کی طرف پیدل روانہ ہوئے۔ نہال صاحب پٹودی ہاؤس میں رہتے تھے اور میرا کمرہ تھا اردو بازار، گلی خان خانہ میں۔ طے ہوا کہ جذبی رات کو میرے غریب خانے پر قیام کریں گے۔ جو واقعی غریب خانہ تھا۔ ایک بیٹھک جس میں فرش پر تین چار آدمی سو سکتے تھے۔ میرے ساتھ میرا بھائی ریاست یہیں سوتا تھا۔ جذبی بھی میرے ساتھ اس چٹائی کے بستر پر ایک لحاف میں لیٹ گئے۔ انہوں نے میری ہمت افزائی کی، کچھ مشورے بھی دئے اور اِدھر اُدھر کی بہت سی باتیں کیں۔ صبح دیر سے اُٹھے۔ میرے گھر ناشتہ کا اہتمام تو تھا ہی نہیں۔ ہم سب کچھ ہوٹل میں ہی کھاتے پیتے تھے۔ اردو بازار میں مرزا جی چائے والے کی دکان پر چائے پی اور جذبی پھر ملنے کا وعدہ کرکے اپنے گھر قرول باغ چلے گئے۔ مگر ان سے ایک دو ملاقاتیں ہوئیں اس کے بعد۔ کیوں کہ میں ۱۹۴۵ء میں بمبئی چلا گیا۔

مجاز کے کمرے میں جذبی سے ملاقات اور ایک حد تک قریب آجانا، میرے لئے اعزاز کی بات تھی۔ میں ان لوگوں میں سے ہوں جنہوں نے اس نسل سے لکھنا سیکھا۔ جذبی ۱۹۴۵ء کا تعلیمی سیشن شروع ہونے کے بعد ''آج کل'' کی ملازمت چھوڑ کر ایم۔ اے کرنے علی گڑھ چلے گئے تھے، اور پھر وہ ساری عمر علی گڑھ میں رہے۔ وہیں پی۔ ایچ۔ ڈی کیا، ملازمت کی اور ریٹائرمنٹ کے بعد کی زندگی کا باقی حصہ بھی علی گڑھ میں گزارا۔

پھر جذبی سے اِدھر اُدھر مشاعروں میں ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ وہ پہلے انجمن ترقی پسند مصنفین کے حامیوں میں تھے۔ مگر جب انجمن کے نصف ذمہ دار لوگوں نے ادب میں ادبیت پر مقصد بلکہ پروپگنڈے کی فوقیت پر زور دیا تو وہ دل برداشتہ ہوگئے۔ ان کے خیالات واضح تھے اور انہوں نے اپنے مجموعہ کلام ''فروزاں'' کے دیباچے میں اپنے موقف کی وضاحت صاف الفاظ میں کی تھی......

''ایک شاعر کی حیثیت سے ہمارے لئے جو چیز سب سے اہم ہے وہ زندگی یا زندگی کے تجربات ہیں۔ لیکن کوئی تجربہ اس وقت تک موضوع سخن نہیں بنتا جب

تک اس میں شاعر کے جذبے کی شدت اور احساس کی تازگی کا یقین نہ ہو جائے۔ یہی دو چیزیں شاعر کو قلم اُٹھانے پر مجبور کرتی ہیں۔ میں ہنگامی ادب کا کچھ زیادہ قائل نہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اِدھر ایک واقعہ ہوا، اُدھر نظم تیار ہوگئی؟ یہ تو اس وقت ممکن ہے جب ذہن پہلے سے اس واقع کے لئے تیار ہو۔ تجربہ تخلیق کی منزل تک پہنچنے کے لئے صرف تخلیق و تجزیے کے مراحل سے نہیں گزرتا۔ بلکہ شاعر کے مزاج سے بھی ہم آہنگ ہوتا ہے۔ اسی کو ہضم کرنا اور رچانا بسانا کہتے ہیں۔ اس کے لئے بعض اوقات کافی مدت درکار ہوتی ہے۔ جو حضرات رچانے بسانے کو غیر ضروری سمجھتے ہیں ان کے یہاں گہرائی اور گیرائی کے بجائے جذباتیت اور سطحیت کا پیدا ہونا لازمی ہے۔"

جذبی کا نظریہ شعر و ادب ترقی پسند مصنفین کے پرشور پروپیگنڈائی دور میں ترقی پسندوں کو پسند نہیں آیا اور اس وقت کے ناقدین نے ان سے بے توجہی برتنی شروع کی اور جذبی آہستہ آہستہ اپنے آپ میں سمٹتے چلے گئے۔ ان کے لکھنے کی رفتار پہلے بھی کم تھی، اب بہت کم ہوگئی، اور وہ کبھی کبھار ہی لکھتے۔ ان کی یہ روش آخر تک جاری رہی۔

ہمارے ادب میں ترقی پسند تحریک کے حوالے سے ایک دور وہ بھی گزرا ہے جب شاعری میں لفظ "میں" استعمال کرنے والا شاعر معتوب ہو رہا تھا۔ اپنی زندگی، اپنے ذاتی مسائل اور اپنا غم (جو شعر کی روح ہوتا ہے) بیان کرنا گھٹیا شاعری اور رجعت پرستانہ فعل سمجھا جانے لگا تھا۔ مجھ پر خود یہ عالم گزرا۔ میں نے انجمن کے بمبئی کے جلسے میں اپنی ایک نظم سنائی، جس میں ذاتی کیف و غم کی بات تھی تو ناخن شناس لوگوں نے تنقید کی کہ اس نظم سے عوام کو کیا حاصل ہوا...... (گویا شاعری فلاحی ادارہ ہوا)۔

تقریباً اسی دور، یعنی ۱۹۴۹ء کی جذبی کی ایک نظم ہے...... "میری شاعری اور نقاد"...... بہت خوبصورت نظم ہے۔ اس کا ایک بند ہے......

کیا کروں اشک اگر پلکوں پہ ڈھل آیا ہے
لیکن اے دوست، مرے درد کے بے حس نقاد
میرے آنسو، مری آہیں بھی تو کچھ کہتی ہیں
میری افسردہ نگاہیں بھی تو کچھ کہتی ہیں
اور داغ دل ناکام دکھاؤں کیسے
دلِ خوں گشتہ کا پیغام سناؤں کیسے

مختصر یہ کہ بقول پروفیسر انور صدیقی......

''اس عرصہ میں ادبی مذاق میں بہت سی پُرشور تبدیلیاں آئیں۔ بہت سی تحریکوں کا ظہور ہوا۔ بہت سی شہرتوں کے پرچم بلند ہوئے اور اترے۔ کم قامت شاعر دیوقامت قرار پائے اور کئی بلند قامت شاعر ماچس کی تیلیوں سے بھی چھوٹے گردانے جانے لگے۔ بہتوں نے خود اپنی شہرت کا اہتمام کیا۔ مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ اہتمام اور بندوبست کسی طرح استمراری ثابت نہ ہوا۔ اس سلسلے میں ہماری ادبی تنقید نے بھی بڑے گل کھلائے اور ادنیٰ پروری کی اور اعلیٰ سے خوفزدہ ہوکر خاموشی کی سازش کا انداز اختیار کرنے میں اپنی عافیت دیکھی۔''

(پیش گفتار، گداز شب، ص:۷)

اور چند لوگوں کی طرح جذبیؔ بھی اسی انداز تنقید کے قتیل ہیں اور ان کو نظر انداز کرکے ترقی پسند تحریک کے غیر دانشمند نقادوں اور اہل کاروں نے ایک ایسے شاعر کے قلم کی روشنائی خشک کردی جو اگر لکھتا رہتا تو اس کی گھائل آواز بیسویں صدی میں ایک میر تقی میر پیدا کرتی۔

جب میں بمبئی سے دہلی ریڈیو اسٹیشن آگیا تو پھر جذبیؔ سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ وہ اردو مجلس پروگرام میں میری دعوت پر تشریف لاتے تھے، اور ہم لوگ پُرانی یادیں تازہ کرتے اور بہت سی دلچسپ باتیں ہوتیں ان کے ساتھ۔ ہر چند کہ ناقدان وقت نے ان کے ساتھ معاندانہ رویہ اختیار کر رکھا تھا۔ مگر ایک حلقہ ان کے مداحوں کا ہمیشہ رہا۔ خاص طور پر ان کے شاگردان رشید ان کے دفاع میں سرگرم رہے۔ ان میں تین نام بہت اہم ہیں...... پروفیسر انور صدیقی، ابن فرید، اور پروفیسر آفاق احمد۔ ابن فرید نے ایک ضخیم نمبر ان کی شان میں نکالنے کا ارادہ کیا۔ مجھ سے کہا تو میں نے ''شاعرِ فروزاں'' نام سے ایک مضمون جذبیؔ کی شاعری پر لکھا۔ ابن فرید کا وہ نمبر تو نہ چھپا، لیکن کچھ عرصہ بعد ''کتاب نما'' (مکتبہ جامعہ) نے ایک خصوصی نمبر جذبیؔ پر نکالا تو اس میں میرا وہ مضمون شائع ہوا اور پھر میں نے اپنی کتاب ''قلم کے سفیر'' میں بھی شامل کیا۔

کچھ سال پہلے کی بات ہے۔ مجھے ''اقبال سمان'' (حکومت مدھیہ پردیش) اعلیٰ ایوارڈ کی جیوری کے ممبر کی حیثیت سے بھوپال بلایا گیا۔ ان دنوں پروفیسر آفاق احمد مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی کے سکریٹری تھے۔ جیوری کے کچھ ممبران کا موڈ دوسرا تھا۔ ایک ''اقبال پسند'' کی بات ہو رہی تھی۔ مگر میں نے اپنی بساط کے مطابق مناسب مدلل دلیل سے جذبیؔ کے نام کی وکالت کی، اور جب جذبیؔ کا نام آیا تو جیوری کے ایک ممبر مجروح سلطانپوری نے بھی کہا کہ اگرچہ

میرے ذہن میں ایک نام اور تھا مگر اب میں بھی جذبی کے نام کی تائید کرتا ہوں، اور اس موقع پر مجروح نے ایک ایمانداری کی بات کہی کہ جذبی صاحب کو یہ انعام مجھ سے پہلے ملنا چاہئے تھا۔ (اس وقت تک مجروح کو "اقبال سمان" مل چکا تھا۔)

جذبی کو جب خبر ملی کہ انہیں اقبال سمان دیا گیا ہے اور میں نے مبارکبادی کا خط لکھا تو مجھے جواب ملا...... "مجھے علم ہے تم مجھ پر مضمون لکھتے ہو اور لوگوں سے میرے لئے لڑتے پھرتے ہو۔ اس بات سے مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ اس خط سے ان کی بے نیازی آشکار ہوتی ہے اور میرے لئے محبت......

جذبی اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ انہوں نے ایک طویل عمر پائی اور ایسی پائدار شہرت جو ادب میں آدمی کو صدیوں زندہ رکھتی ہے۔ وہ ایک اچھے شاعر، ایک اچھے انسان اور ایک اچھے دوست تھے۔ ان کو اپنے شاگردوں سے بہت پیار تھا۔ وہ کسی کی غیبت نہیں کرتے تھے۔ جذبی آخری وقت تک اپنے اس نظریے پر قائم رہے جس کا اظہار انہوں نے اپنی پہلی کتاب "فروزاں" میں کیا تھا۔ وہ کم گو ضرور تھے، مگر پُر گو تھے۔ مومن خاں مومن کی طرح، مجروح سلطانپوری کی طرح، ان کو یقین تھا کہ ان کی شاعری سدا بہار ثابت ہوگی۔

چمن کی نذر ہیں یہ پارہ ہائے قلب و جگر
یہ پھول وہ ہیں کہ شاید کبھی نہ مرجھائیں
(جذبی)

مجھے فخر ہے کہ جذبی مجھے عزیز رکھتے تھے۔ میرے دوست تھے اور میں نے ان کے ساتھ بہت سے قیمتی لمحے گزارے ہیں۔ ○○

कौमी काउंसिल बराए फ़रोग़-ए-उर्दू ज़बान

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

National Council for Promotion of Urdu Language

M/o HRD, Dept. of Secondary & Higher Education, Govt. of India

قومی اردو کونسل کی کارگزاریوں کی ایک جھلک

قومی اردو کونسل اپنے قیام کے بعد سے ہی اردو زبان و ادب اور تعلیم کی ترویج و ترقی کے لیے کوشاں رہی ہے اور اس کے لیے مختلف پروگراموں اور اسکیموں پر عمل درآمد جاری ہے۔ ان کوششوں کے اثرات ملک بھر میں دیکھے اور محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ رواں مالی سال میں کونسل کی جانب سے فروغ اردو کے لیے کی جانے والی سرگرمیوں کی ایک جھلک۔

پیشہ ورانہ کورس کی کتابوں کا اردو میں ترجمہ: بدلتے ہوئے سائنسی اور تکنیکی منظرنامے میں یہ ضروری ہے کہ اردو بھی عہد حاضر کے تقاضوں سے پوری طرح ہم آہنگ ہوجائے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب اردو میں ٹیکنالوجیکل اور پیشہ ورانہ علوم پر بنی کتابیں دستیاب ہوں۔ اسی مقصد کے تحت کونسل نے پیشہ ورانہ کورسز کی افادہ کتابوں کا اردو ترجمہ شائع کیا ہے۔ یہ کتابیں حسب ذیل ہیں: الیکٹرانکس ٹیکنالوجی، گھر کی وائرنگ کا تعارف، گھریلو برقی آلات کی مرمت اور دیکھ بھال، گل سازی کا تعارف، اسکوٹر اور موٹر سائیکل (مرمت اور دیکھ بھال)، پاور ٹرانسفارمر کی دیکھ بھال اور مرمت، زرگراں، پروحافظتی آلات کی مرمت اور دیکھ بھال، لکڑی کی دستکاری، باغ، بنیادی کمانڈ لکنیک، گھریلو اشیا کی دیکھ ریکھ، دودھ اور دودھ سے بنی اشیا، دودھ کی پیداوار اور دیکھ بھال، عام باغبانی، بانس دستکاری، زرم کھلونے اور شہد کی مکھیاں پالنا۔ ان کے علاوہ تقریباً 50 آئی ٹی آئی کی کتابوں کے ترجمے کروائے جارہے ہیں۔

انفارمیشن ٹیکنالوجی: ایک سالہ ''ڈپلوما ان کمپیوٹر ایپلیکیشن، اینڈ ملٹی لنگول (ڈی۔ٹی۔پی۔)'' کورس 1999 سے ملک گیر سطح پر جاری ہے۔ جس کے 223 مراکز 22 صوبوں کے 107 ضلعوں میں نئی اردو نسل کے تقریباً 13820 طالب علموں (5707 لڑکے اور 8123 لڑکیاں) کو سالانہ تربیت فراہم کررہے ہیں۔ اب تک 22905 طالب علموں (12469 لڑکے اور 10436 لڑکیاں) کو ڈپلوما دیا جاچکا ہے جن میں سے تقریباً 60 فیصد سے زیادہ طلبا برسر روزگار ہیں۔ اس کورس کا مقصد اردو داں طبقے کو ٹیکنالوجیکل منظرنامے کا حصہ بنانا اور روزگار کے مواقع فراہم کرنا ہے۔

اردو مراسلاتی کورس: قومی اردو کونسل نے ہندی اور انگریزی کے ذریعے اردو رسم خط سکھانے کے لیے یک سالہ ڈپلوما کورس ان اردو لینگویج شروع کیا ہے۔ اس کورس کو ملک گیر سطح پر پذیرائی حاصل ہوئی ہے۔ رواں مالی سال کے دوران کونسل نے اردو کے 153 اسٹڈی سینٹر 22 صوبوں کے 100 ضلعوں میں قائم کیے ہیں جن میں کنٹیکٹ کلاسز کی سہولت موجود ہے۔ اردو ڈپلوما کورس میں تقریباً 19 ہزار طلبہ (12327 لڑکوں اور 6673 لڑکیوں) نے داخلہ لیا ہے۔ جن میں 5410 ہندی میڈیم اور 13590 انگریزی میڈیم کے ہیں۔ اب تک 43497 طالب علموں (25214 لڑکے اور 18283 لڑکیاں) کو ڈپلوما دیا جاچکا ہے۔

اشاعتی سرگرمیاں: قومی اردو کونسل حکومت ہند کا واحد اشاعتی ادارہ ہے جو صرف اردو کتابیں شائع کرتا ہے۔ کونسل کی اشاعتی سرگرمیوں کے تحت بچوں کے ادب اور اردو ذریعۂ تعلیم کی نصابی کتابوں پر خاص توجہ دی جارہی ہے۔ اشاعتی منصوبوں میں اردو زبان کے کلاسیکی ادب کی اشاعت کے علاوہ لغات، انسائیکلوپیڈیا، حوالہ جاتی کتابیں اور دنیا کی کلاسیک اور ٹیکنالوجی اور سماجی علوم کی تمام شاخوں سے متعلق کتابیں طبع عام پر لائی جارہی ہیں۔ رواں مالی سال کے دوران دسمبر 2006 تک 98 کتابیں شائع ہوئی ہیں۔

کلاسیکی ادب کی اشاعت: قومی اردو کونسل اردو کی ان کلاسیکی کتابوں کی کر اشاعت پر خصوصی توجہ دے رہی ہے جو اردو زبان و ادب کے ارتقا میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں اور اب آہستہ آہستہ نایاب ہوتی جارہی ہیں۔ اس سلسلے میں کونسل نے 24 جلدوں میں کلیات پریم چند شائع کیا ہے۔ اس کے علاوہ کلیات میر (جلد اول)، کلیات آغا حشر کاشمیری (سات جلدیں)، کلیات سرور، کلیات قلی قطب شاہ، دیوان غالب، دیوان درد، دیوان حسرت، کلیات مصحفی، کلیات ذوق، کلیات جگر، کلیات اکبر الہ آبادی، کلیات ولی اور کلیات سردار جعفری (دو جلدیں) بھی کونسل شائع کرچکی ہے۔ کونسل ہندوستانی اردو اکیڈمی کی شائع کردہ کتب بھی شائع کررہی ہے جو اب نایاب ہیں۔

رسائل و جرائد: قومی اردو کونسل اردو خبروں اور نظریات و خیالات پر مشتمل ماہنامہ ''اردو دنیا'' اور سہ ماہی علمی مجلہ ''فکر و تحقیق'' گزشتہ سات سال سے مسلسل شائع کررہی ہے۔ اردو خبروں، حکومت کی پالیسیوں کے بارے میں معلومات، تجزیاتی اور معلوماتی مضامین کی وجہ سے ''اردو دنیا'' کی اردو حلقوں میں غیر معمولی پذیرائی ہورہی ہے۔ ''فکر و تحقیق'' اپنے اعلیٰ تحقیقی مضامین کی بنا پر پسند کیا جاتا ہے۔

کل ہند اردو کتاب میلے اور کتابوں کی فروخت: قومی اردو کونسل نے اب تک آٹھ کل ہند اردو کتاب میلے منعقد کیے ہیں جن میں ہندوستان بھر کے اردو ناشرین نے شرکت کی۔ رواں مالی سال کے دوران ایک کل ہند اردو کتاب میلہ اور کوہاٹی میں بنگال اردو کتاب میلے کا انعقاد کیا جارہا ہے۔ اپنی مطبوعات کو وسیع تر عوامی حلقوں تک پہنچانے کے لیے کونسل نے رواں مالی سال میں ملک کے مختلف شہروں میں منعقد ہونے والے سات قومی کتاب میلوں میں شرکت کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

سیمینار اور ورکشاپ: قومی اردو کونسل نے پچھلے مالی سال میں منشی پریم چند کے 125 ویں یوم ولادت کے موقع پر 31 جولائی تا 02 اگست 2005 لکھنؤ میں سہ روزہ منشی پریم چند کا انعقاد کیا گیا جس میں مختلف شعبہ ہائے زندگی سے وابستہ معروف پریم چند نے شرکت کی اور ان کی ادبی و سماجی خدمات کا تفصیلی جائزہ لیا۔ نیز ''فروغ اردو کے لیے نئی حکمت عملی'' کے تحت سہ روزہ قومی اردو کانفرنس 19 تا 21 فروری 2006 لال قلعہ، اورنگ آباد میں منعقد کی گئی۔ رواں مالی سال کے دوران قومی اردو کونسل کے اشتراک سے ایسٹرن ہل یونیورسٹی، شیلانگ (میگھالیہ) کے اشتراک سے 27 تا 28 نومبر 2006 دو روزہ کانفرنس بعنوان ''ترقی پسند خواتین مصنفوں کی خدمات۔ ڈاکٹر رشید جہاں کے خصوصی حوالے سے'' ایسٹرن ہل یونیورسٹی آڈیٹوریم میں منعقد کی۔ جس میں متعدد دانشوروں اور ادیبوں نے شرکت کی۔ اس کے علاوہ مختلف رضاکار تنظیموں اور سرکاری و غیر سرکاری اداروں کو سیمینار اور ورکشاپ وغیرہ کے انعقاد کے لیے 4,94,440 روپے جاری کیے گئے۔

کتابوں کی تھوک خریداری اور اردو کتب خانوں کی مدد: اس اسکیم کے تحت رواں سال میں اب تک 191 کتابیں (149 اردو، 5 عربی فارسی کی کتابیں اور 39 رسائل و جرائد) خریدی گئی ہیں۔ یہ کتابیں ہندوستان کے تقریباً 400 کتب خانوں میں مفت تقسیم کی گئی اور کی جارہی ہیں۔

اردو نیوز سروس: جدوجہد آزادی، قومی یکجہتی، لسانی و مذہبی اکائیوں کی ذہنی تربیت اور تہذیبی و ثقافتی ہم آہنگی کے فروغ میں اردو صحافت کے نمایاں رول کے پیش نظر قومی اردو کونسل نے اردو صحافت کے فروغ کے لیے مناسب قدم اٹھائے ہیں۔ کونسل چھوٹے اور درمیانی درجے کے اردو اخبارات کو مالی اعانت فراہم کرتی ہے تاکہ وہ یو۔ این۔ آئی۔ کی اردو سروس سے مستفید ہوسکیں۔ اس اسکیم نے اردو اخبارات کے لیے خبروں اور دیگر مواد کی فراہمی کو آسان کردیا ہے۔ فی الوقت 56 اردو اخبارات یو۔ این۔ آئی۔ کی اردو سروس کا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

رضاکار تنظیموں کے ساتھ تعاون: اردو زبان کی ترویج و ترقی میں رضاکار تنظیموں کا نمایاں رول رہا ہے۔ تنظیموں کے عوام سے براہ راست رابطے کی وجہ سے اسکیموں کے نفاذ اور ان کے دائرۂ اثر میں وسعت آئی ہے۔ کتابوں کی اشاعت نیز اردو کے فروغ کی دیگر سرگرمیوں مثلاً سیمینار، ورکشاپ اور محفل مذاکرہ وغیرہ کے لیے بھی کونسل رضاکار تنظیموں کو مالی مدد فراہم کرتی ہے۔

عربی اور فارسی زبانوں کی ترویج و ترقی: ہندوستان کی مشترکہ تہذیب و ثقافت کے فروغ میں عربی اور فارسی کے تاریخی رول کو پیش نظر میں رکھتے ہوئے کونسل ان زبانوں کی ترویج و ترقی کے لیے کوشاں ہے۔ کونسل مختلف مکاتب، مدارس اور جزوقتی اسکولوں کو عربی و فارسی کلاسوں کے لیے لاکھوں روپے کی مالی اعانت فراہم کرتی ہے۔ کونسل کی طرف سے عربی کا دو سالہ ڈپلوما کورس بھی اپریل 2002 میں شروع کیا گیا۔ سیشن 2005-07 اور 2006-08 میں بالترتیب 7833 اور 6166 طالب علموں نے داخلہ لیا۔ اس طرح 13,999 طلبہ یہ کورس کررہے ہیں۔ اس کورس کے طلبہ کی تعداد میں قابل ذکر اضافہ ہوا ہے۔ کونسل نے طالب علموں کی سہولت کے پیش نظر ملک کے طول و عرض میں 177 عربی اسٹڈی سینٹر قائم کیے ہیں۔ ان اسٹڈی سینٹروں میں کنٹیکٹ کلاسز کی سہولت موجود ہے۔

●●●

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید

جذبی کی نظم نگاری

معین احسن جذبی کا شمار ہمارے اُن شاعروں میں ہوتا ہے جنہیں عصر حاضر میں اردو غزل کی آبرو کہا گیا ہے۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ اِدھر ہم نے جذبی کی غزل کی انفرادیت اور اس کے امتیازی رنگ رُخ کو تو تسلیم کیا، لیکن اُن کی نظم کو ایک حد تک نظرانداز کر گئے۔ جذبی کا شعری سرمایہ مجموعے کئی شائع ہوئے جو یوں بھی ایسے ضخیم نہیں ہیں۔ بعد ازاں اُن کا مجموعہ ''گدازِ شب'' اشاعت پذیر ہوا، جس کو اُن کے کلیات کی حیثیت حاصل ہے۔ کہنے کو یہ کلیات ہے لیکن کل ۱۴۰ رصفحات پر مشتمل ''گدازِ شب'' میں غزلیں بھی ہیں اور نظمیں بھی، لیکن غزل کا پلہ بھاری ہے جو ہونا بھی چاہیے تھا۔ غزل کا پلہ بھاری ہونے کے باوصف اُن کی نظمیں اپنی دُنیا آپ بساتی ہیں، متوجہ کرتی ہیں، انفرادیت رکھتی ہیں، دلکش ہیں اور دلآویز ہیں۔

جذبی کی شاعری کا زمانہ وہ ہے جس میں نظم گوئی بھی زور وشور سے جاری تھی اور غزل گوئی بھی۔ ادھر نظم نگاروں میں علامہ اقبال، جوش ملیح آبادی، اختر شیرانی اور (ایک حد تک) اسرارالحق مجاز کے نام ملتے ہیں تو غزل گو شاعروں میں شاد عظیم آبادی، حسرت، فانی بدایونی، فراق گورکھپوری، جگر مرادآبادی اور اصغر گونڈوی کا شہرہ تھا۔ کچھ تو اُن کا مزاج اور پس منظر بھی کہہ لیجیے کہ آگرہ میں جہاں انہوں نے تعلیم کے سلسلے میں کئی برس گزارے، انہیں میکش اکبرآبادی اور فانی بدایونی کی رفاقت حاصل رہی۔ فانی کو ابتداً انہوں نے اپنا کلام بھی دکھلایا۔ اس کے اثرات اُن کے کلام پر ترتیب پانے لازمی تھے اور یہ اثرات ترتیب پائے بھی...... اور تو اور، انہوں نے اپنا تخلص ملال اختیار کیا۔ کوئی عجب نہیں کہ جذبی کی شاعری فانی کی شاعری کا چربہ بن جاتی، تاہم اور محرکات بھی رہے ہوں گے۔ لیکن خاص طور پر ترقی پسند تحریک کے باعث جذبی کے مزاج میں تبدیلی آئی، جس کے اثرات اُن کی شاعری میں جھلکتے ہیں۔ انہوں نے اب اپنا تخلص بھی ملال کے بجائے جذبی پسند کیا۔ کچھ تو اپنے مزاج کی الم پسندی، حزنیہ کیفیات اور بہت کچھ اطراف واکناف کے اَدلتے بدلتے حالات، قومی منظرنامہ کے

نشیب وفراز، دگرگوں ہوتے رنگ کے جذبی کی شاعری میں کم ہی سہی، آخر وقت تک المیہ اور حزن وملال کے رنگ ملتے ہیں۔ بعض نظموں میں یہ لے تیز ہے اور بعض میں مدھم۔ ترقی پسند تحریک کے اثرات کے باوجود جذبی کے یہاں یاسیت اور قنوطیت کی جھلکیاں مل ہی جاتی ہیں۔ جذبی نے ان سے کچھ یوں کام لیا کہ ہمعصر ترقی پسند شاعروں میں اُن کا رنگ اُن کا اپنا ہی رنگ بن جاتا ہے، جس میں تھوڑی بہت یاسیت کی آمیزش ہے اور یہ جذبی کے مزاج ہی کا نہیں، ان کے ماحول کا ردِ عمل بھی تھا۔ گویا یہ صورتیں ذاتی بھی تھیں اور اجتماعی بھی۔ مجھے یہاں یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ ہمارے کئی ترقی پسند شاعروں کے پاس باضابطہ اور انقلابی آہنگ اور رجائی زاویہ نظر کے باوجود مایوسی اور نا اُمیدی جھانکتی نظر آتی ہے۔ ماحول سے متاثر ہونا بھی لازمی تھا۔

تعداد میں کم ہونے کے باوجود جذبی کی کئی منظومات معرکتہ آراء ہیں اور اُن میں چند ایک ایسی ہیں جو اردو نظم کے سخت سے سخت انتخاب میں یقیناً جگہ پائیں گی۔ جذبی عام غزل گو شاعروں کی طرح اپنی دُنیا میں آپ مست ومگن نہیں رہے اور نہ غم محبوب ہی کا رونا رویا۔ ان کی غزلیں ہی جیتی جاگتی عصری مسائل کی حامل نہیں، بلکہ ان کی نظموں میں بھی معاشرے کے خدوخال جلوے دکھاتے ہیں۔ جذبی کی شاعری کسی حد تک ترقی پسند تحریک سے متاثر ہونے کا نتیجہ نہیں، یہ تو ترقی پسند تحریک سے پہلے کی باتیں ہیں۔ ''ہلالِ عید'' اُن کی ایسی ہی نظم ہے جو ۱۹۳۴ء میں کہی گئی۔ اس میں قنوطی رنگ ضرور ہے، بے چارگی اور مایوسی کی فضا بھی ہے، لیکن اپنے اسی زاویہ سے آس پاس کے حالات پر نظر دوڑاتے ہوئے ''ہلالِ عید'' سے یہ اشعار دیکھیے۔ شاعر ہلالِ عید سے مخاطب ہے......

اہلِ عشرت کی نظر میں آنکھ کا تارا ہے تو
آہ! لیکن دل جلے کہتے ہیں انگارا ہے تو
اِک طرف کرتا ہے تو ہنس ہنس کے لوگوں سے کلام
اِک طرف تو کھینچتا ہے اپنی تیغ خوش خرام
اِک طرف تو عیش کا احساس کر دیتا ہے تیز
اِک طرف تو نشۂ افلاس کر دیتا ہے تیز
تیری زرپاشی ہے کب ہم غم کے ماروں کے لیے
آہ، تو نکلا ہے ان سرمایہ داروں کے لیے

......اور اُن کی یہ نظم ''فطرت، ایک مفلس کی نظر میں'' اگرچہ ۱۹۳۷ء کی تحریر کردہ ہے لیکن منظر

وہی اداسی اور ویرانی لیا ہوا، زخمی روح کی چیخ، بھوک سے تلملاتے، ایک ایک روٹی کو ترستے، اپنی حسرتوں کو اپنے ہاتھوں کفن پہنائے ہوئے انسان۔ نظم پڑھیے تو ایک وسیع اور کشادہ کینواس سامنے آتا ہے۔ ساری نظم اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ میں یہاں صرف آخری دو اشعار پیش کر رہا ہوں......

وہ لاکھ ہلالوں سے بھی حسیں، کیسی زہرہ کیسی پروِیں
اک روٹی کا ٹکڑا جو کہیں مل جائے مجھے بازاروں میں
جب جیب میں پیسے بجتے ہیں، جب پیٹ میں روٹی ہوتی ہے
اس وقت یہ ذرہ ہیرا ہے، اس وقت یہ شبنم موتی ہے

اس پہلو سے بھی صرف نظر نہیں کیا جاسکتا کہ ترقی پسند تحریک سے پہلے کہی ہوئی نظموں میں بھی اُن کے ہاں رجائیت اور آس و اُمید کی باتیں ملتی ہیں۔ نظم ''گل'' ۱۹۳۳ء میں کہی گئی، پڑھیے تو اندازہ ہوگا۔ یہ تین اشعار ملاحظہ ہوں......

اے گل رنگیں قبا، اے غازۂ روئے بہار
تو ہے خود اپنے جمالِ حسن کا آئینہ دار
گھیر لیں جیسے عروسِ نو کو ہمسن لڑکیاں
یوں تجھے گھیرے ہوئے ہیں نونہالانِ چمن
تو زمینِ رنگ و بو، تو آسمانِ رنگ و بو
مختصر یہ ہے کہ تو ہے اِک جہانِ رنگ و بو

ترقی پسند تحریک سے وابستگی کے بعد جذبی کی شاعری میں تبدیلی ضرور آئی ہے لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا، ان کے مزاج میں جو غمگینی، خستگی اور شکستگی ہے، حرماں نصیبی، اداسی، اور مردنی ہے، آنسو اور آہیں ہیں، اگر میں یہ کہوں تو بے جا نہ ہوگا کہ یہ رنگ آخر تک برقرار رہتا ہے۔ کہیں کہیں مدھم ضرور ہوتا ہے لیکن ان کی شاعری کے افق سے غائب نہیں ہوتا۔ ''چشمِ سوال، بیزار نگاہیں، توہم'' اور ''موت'' میں اِن رنگوں کو دیکھیے۔ چاہتا تو تھا کہ اِن ساری نظموں سے اشعار پیش کروں لیکن صرف نظم ''آزار'' کا یہ آخری بند ملاحظہ ہو......

اور یہ شور گرجتے ہوئے طوفاں کا
ایک سیلاب سسکتے ہوئے انسانوں کا
ہر طرف سینکڑوں بل کھاتی دھویں کی لہریں
ہر طرف ڈھیر جھلستے ہوئے ارمانوں کا

زندگی اور بھی کچھ خوار ہوئی جاتی ہے
اب تو جو سانس ہے آزار ہوئی جاتی ہے

......اور جب زندگی خوار اور ہر سانس آزار ہو جائے تو پناہ کہاں ملے گی؟ کوئی اُمید نہیں، کوئی روشنی نہیں، کوئی تارہ نہیں۔ سارے دروازے بند، سارے راستے مسدود۔ ''موت'' جذبی کی ایک اہم نظم ہے۔ زمانہ کی بے دردی، سفاکی، زندگی کی بے رحمی، بے مروتی، تغافل، صبر آزما ماحول، دشوار گزار حالات، بے معنی روز و شب، پُر خار راہیں، بے مقصد زیست...... جذبی نے اس کرب و بلا، ہمت شکن حالات اور معاشرہ کی لایعنیت کو نظم ''موت'' میں فنکاری کے ساتھ پیش کیا ہے، پہلے ہی بند سے نظم کی فضا کا اندازہ کیا جا سکتا ہے......

اپنی سوئی ہوئی دُنیا کو جگا لوں تو چلوں
اپنے غم خانے میں اِک دھوم مچا لوں تو چلوں
اور اِک جام مئے تلخ چڑھا لوں تو چلوں
ابھی چلتا ہوں ذرا خود کو سنبھالوں تو چلوں

ڈاکٹر محمد حسن نظم ''موت'' کے بارے میں لکھتے ہیں......

''جذبی کے لیے زندگی کافی تلخ کام رہی ہے۔ والد سے تعلقات ٹھیک نہیں تھے۔ مفلسی کا دور دورہ تھا۔ ذرائع آمدنی مسدود، حالات ہمت شکن، تندرستی جواب دے رہی تھی۔ ایک خاصا لمبا آپریشن بھی ہوا جس سے اور زیادہ پریشان ہو گئے۔ بیماری اور مفلسی کا سلسلہ لمبا کھنچا تو بار بار خودکشی کے بارے میں سوچا اور اُن کی نظم ''موت'' اپنی خواہشِ مرگ کے اظہار کے طور پر تصنیف ہوئی۔''

(عصری ادب، ۱۹۵۰ء، ص: ۱۷)

لیکن ترقی پسند تحریک نے ان سے کافی اچھی نظمیں بھی کہلوائیں۔ مثلاً ''خوابِ ہستی''، لگ بھگ ہر ترقی پسند شاعر کے پاس کم و بیش اس نوع کی نظمیں/ اشعار ضرور مل جائیں گے جن میں محبوب کو ابتدائے عشق کے رنگین زمانے بھولنے اور زمانے کی سختیوں کا مقابلہ کرنے کی ہمت پیدا کرنے پر زور دیا ہے۔ ''مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ......'' (فیض احمد فیض)، ''اُٹھ مری جان، مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے......'' (کیفی اعظمی)، ''میری محبوب کہیں اور ملا کر مجھ سے......'' (ساحر لدھیانوی)، اور ''ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن......'' (اسرار الحق مجاز) نظمیں/ اشعار رنگ روپ میں بھلے ہی مماثلت نہ رکھتے ہوں، مگر بنیادی خیال میں یکسانیت ضرور ہے۔

''خواب ہستی'' سے دو بند ملاحظہ کیجئے......

تجھ کو جس دل سے محبت تھی، وہ اب دل ہی نہیں
رقص جس کا تجھ کو بھاتا تھا، وہ بسمل ہی نہیں
رنگِ محفل تجھ سے کیا کہیے، وہ محفل ہی نہیں
بھول جا اے دوست وہ رنگین زمانے بھول جا
اب نہ وہ شوقِ تصور، اب نہ ذوقِ فغاں
مٹ رہے ہیں رفتہ رفتہ عہد رفتہ کے نشاں
دھندلی دھندلی سی نظر آتی ہیں کچھ پرچھائیاں
بھول جا اے دوست وہ رنگیں زمانے بھول جا

نظم ''تقسیم'' میں جذبی نے تقسیمِ ملک کے ناسازگار اور مضر اثرات کو نہایت دردمندی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ایمائیت اور اشاریت کی فضا میں تقسیمِ ملک کے جو حامی تھے، اُن کے لیے تقسیم اور زیادہ باعث عبرت ثابت ہوئی کہ کسی نے کچھ پایا نہیں...... نہ تقسیم چاہنے والوں نے اور نہ تقسیم نہ چاہنے والوں نے...... ہر سمت وہی زیاں، خستگی، پشیمانی، بے قراری، دل شکستگی، فتنہ گری، خاک بسری، جورو جفا، قہر وبلا، بے ثمری، خستہ جانی، بے چارگی اور ہجر کی طویل رات کے سوا اور کچھ ہاتھ نہ آیا۔ واقعہ یہ ہے کہ خاص طور پر ترقی پسندوں میں شاید ہی کوئی شاعر ہوگا جس نے ایسے موضوع کو نہ اپنایا ہو۔ فیض احمد فیض کی نظمیں ''صبح آزادی، اگست ۱۹۴۷ء، یہ داغ داغ اُجالا، یہ شب گزیدہ سحر'' کس کو یاد نہیں، ''نیا سورج'' بھی ایک ایسی ہی نظم ہے۔ دونوں کا موضوع ایک ہی کہنا چاہیے۔ سوائے اس کے کہ ''نیا سورج'' اشاریتی زیادہ ہے......

ہزاروں برس کے یہ ٹھٹھرے سے پودے
ہزاروں برس کے یہ سمٹے سے پودے
یہ ہیں آج بھی سرد، بے حال، بے دم
یہ ہیں آج بھی اپنے سر کو جھکائے

......ان اشعار کو پڑھتے ہوئے فیض احمد فیض کی نظم ''کتے'' اور ساحر کی نظم ''اجنبی محافظ'' شیشۂ ذہن پر اُبھر آتی ہیں۔ خصوصاً فیض کی نظم کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں......

یہ گلیوں کے آوارہ، بیکار کتے
کہ بخشا گیا جن کو ذوقِ گدائی

زمانہ کی پھٹکار سرمایہ اِن کا
جہاں بھر کی دھتکار ان کی کمائی

''میری شاعری اور نقاد'' کہنے کو وہ نظم ہے جس میں نقاد اور شاعر کا مکالمہ ہے۔ نقاد کو گلہ ہے کہ شاعر کے احساس میں سرمستی و کیف نہیں اور نہ انفاس میں بوئے مئے جام ہے...... وغیرہ وغیرہ۔ شاعر اِس کا جواب دیتے ہوئے نقاد کو دُنیا کے حالات کی سمت توجہ دلاتا ہے کہ زندگی تاریکیوں کے حوالہ ہوتی جارہی ہے۔ نظر خاموش ہے، راہیں مسدود ہیں، فضا بھیانک ہے، تاریکیاں وسعت اختیار کرتی جارہی ہیں، موت کا دیوتا شہپر کھولے ہوئے ہے۔ ستاروں کی دمک اور شعلوں کی لپک چھینی جارہی ہے، ویرانیاں زمانے کا مقدر بنتی جارہی ہیں۔ ایسے میں سرمستی و کیف اور بوئے جام کی باتیں کہاں...... ایسے میں آنکھ میں آنسو اور لب پر آہیں نہ ہوں تو اور کیا ہو؟ اِس عنوان کو بھی کئی ترقی پسندوں نے اپنا موضوع بنایا ہے۔

جذبی نے اپنے رفقاء آل احمد سرور، فیض احمد فیض، سجاد ظہیر، اسرار الحق مجاز اور اختر اورینوی کے حوالہ سے بھی منظومات تحریر کی ہیں۔ ان نظموں کا کینوس غیر معمولی طور پر کشادہ ہے۔ ان میں زمانہ کی ناشناسی، ناقدری، ریاکاری، عیاری، جوڑ توڑ، سازشوں، منافقت، بے ایمانی، بددیانتی، اور سیاہ کاری کی داستانوں کو رقم کر دیا گیا ہے۔ یہاں چاہے تذکرہ آل احمد سرور یا فیض کا ہو، لیکن بات ہزاروں افراد کی ہے۔ جذبی کا لہجہ تیکھا اور ترچھا بھی ہے، احتجاج کی لے بھی ہے۔ ظلم اور ستمگر طاقتوں کا ظلم وستم بھی ہے اور مظلوموں اور مقہوروں کی معصومیت اور سادہ لوحی بھی۔ ظلم سہنے اور سہتے رہنے کا اُن کا کردار بھی۔ یہاں ان کی نظم ''جرم بے گناہی''، جو فیض اور سجاد ظہیر کی سزا کا فیصلہ سن کر ترقیم کی گئی ہے، سے چند اشعار ملاحظہ ہوں......

وہی ہے تازگی رسم یوسف و منصور
کہ حد وہی ہے ابھی جرم بے گناہی کی
شمیم گل سے پریشاں ہے باغباں کا دماغ
یہی خطا ہے مگر بادِ صبح گاہی کی
سیاہیوں کی بھی تقلید جاگ اُٹھی جذبی
کہ مہر و ماہ ہیں آغوش میں سیاہی کی

......اور اب گفتگو جذبی کی دو منظومات کے بارے میں...... ''مطربہ'' اور ''طوائف''...... مطربہ اور طوائف کا معاشرہ میں جو بھی کردار ہو، وہ اپنی جگہ، شاعر کو مطربہ کے مقابلہ میں طوائف سے زیادہ ہمدردی ہے۔ ''مطربہ'' میں مطربہ کے ناز و انداز، شوخیوں، حیا اور ہوش اڑانے والے

جلوؤں کا بیان ہے۔ لیکن یہ سب محاکاتی انداز ہے، منظرنگاری ہے، پیکرتراشی ہے۔ شاعر کو مطربہ سے کوئی جذباتی وابستگی محسوس نہیں ہوتی۔ اس نے جو دیکھا، بیان کر دیا۔ ویسے مصرعہ ''گاہ اپنی بے حجابی سے کیے پیدا حجاب......'' سے مترشح ہے کہ وہ مطربہ کو اپنی معاشرتی اور اخلاقی سطح سے کم پاتا ہے، جبکہ ''طوائف'' میں وہ طوائف کو اتنی اونچی اور اعلیٰ اقدار کا حامل قرار دیتا ہے کہ اس کے قدموں پر سجدہ بھی روا رکھتا ہے...... اور یہ بات بھی خاطرنشان رہے کہ طوائف حد درجہ حساس ہے، شاعر کی محبت بھی اس کو گوارا نہیں۔ وہ شاعر اور شاعر کے عرضِ وفا سے بیزار ہے کہ معاشرہ میں وہ اپنے وزن و وقار کو سمجھتی ہے۔ ''مطربہ'' میں مطربہ کے کردار سے قاری/ سامع کو کوئی ہمدردی پیدا نہیں ہوتی لیکن ''طوائف'' میں طوائف سب کی توجہ اور ہمدردی حاصل کر لیتی ہے۔ شاعر ہی کی نہیں، معاشرہ کی بھی...... طوائف سے ایک اُنس اور اپنائیت محسوس ہوتی ہے اور شاعر طوائف کو کوئی الزام دینے کی بجائے خود کو کم مرتبت اور فروتر محسوس کرتا ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں......

ہائے جلتی ہوئی حسرت یہ تری آنکھوں میں
کہیں مل جائے محبت کا سہارا تجھ کو
اپنی پستی کا بھی احساس پھر اتنا احساس
کہ نہیں میری محبت بھی گوارا تجھ کو
اور یہ زرد سے رخسار، یہ اشکوں کی قطار
مجھ سے بیزار، مرے مرضِ وفا سے بیزار

قابلِ ذکر پہلو یہ ہے کہ ان دونوں منظومات میں ''طوائف'' مختصر ہے۔ ''مطربہ'' ۱۱/اشعار پر مشتمل ہے اور ''طوائف'' ۷/اشعار پر۔ لیکن ''طوائف'' ارتقاءِ خیال اور ارتکازِ فکر کی اچھی مثال ہے۔ اس میں کفایت لفظی بھی ہے، فنکارانہ عمل، صناعی اور سلیقہ مندی بھی ہے۔ جہاں تک معنویت کا تعلق ہے، یہ خاصی تہہ دار اور رنگ رس رکھتی ہے۔ ''مطربہ'' ترقی پسند تحریک سے قبل ۱۹۳۳ء میں تحریر کردہ ہے اور ''طوائف'' کا سنہ تحریر ۱۹۴۱ء ہے۔ یہ ترقی پسند رجحانات کا اثر بھی ہو سکتا ہے کہ عورت کے طوائف بننے میں عورت کم ذمہ دار ہوتی ہے اور یہ معاشرتی اور معاشی مسائل ہوتے ہیں جو کسی عورت کو طوائف کے کوٹھے پر پہنچا دیتے ہیں۔ لہٰذا اس سے ہمدردی اخلاقی اقدار کا تقاضہ ہے۔

جذبی کی نظمیں، ''منزل تک''، ''میرا ماحول'' اور ''اے دوست'' وغیرہ اُن کی فنکارانہ مہارت اور شائستہ اُسلوب شعری کی عمدہ مثالیں ہیں۔

وجوہ کچھ بھی ہوں، جذبی نے بہت کم لکھا لیکن جو بھی لکھا، منتخب لکھا۔ غزل گوئی میں تو وہ اپنی مثال آپ ہیں لیکن غزل ہی کیا، نظم نگاری میں بھی انہوں نے مرتبہ پایا۔ اس زاویہ سے کہ اُن کی نظموں کی تعداد کچھ زیادہ نہیں، ۳۰؍ سے بھی کم ہے، اُن کی نظموں کا جائزہ لیتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ وہ ترقی پسند تحریک ہی کے نہیں، مجموعی طور پر اردو کے بھی ممتاز اور اہم نظم نگاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ اُن کی چند نظمیں تو اردو شاعری میں وزن و وقار کی حامل اور اِس کی آبرو ہیں۔ ○○

عمران احمد عندلیب بستوی

خصوصی مطالعہ

پاکیزہ جذبات کا آئینہ ہے جذبؔی کی شاعری

معین احسن جذبؔی اتر پردیش کی بستی مبارکپور میں ۲۱ راگست ۱۹۱۲ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے دادا عبدالغفور بھی شاعر تھے۔ ان کے والد گزیٹیڈ آفیسر تھے۔ جذبؔی ابھی چار برس کے تھے کہ ان کی والدہ کا انتقال ہوگیا۔ پھوپھی اور دادی نے جذبؔی کا کافی خیال رکھا۔ سوتیلی ماں نے سوتیلے پن کا ثبوت دیا اور والد نے بھی نگاہیں پھیر لیں۔ یہی وہ حالات تھے کہ جذبؔی نے اپنے رنج والم کے اظہار کے لئے شاعری کا سہارا لیا اور جذبات و احساسات کی ترجمانی کرنے لگے۔

جذبؔی نے اپنی شاعری کی ابتداء غزل سے کی۔ شروع میں انہوں نے صادق جھانسوی اور حامد شاہجہانپوری سے اپنے کلام پر اصلاح لی، اور استاد اور شاگرد کے پرانے طریقے کو برقرار رکھا۔ جذبؔی کا ابتدائی کلام مطبوعہ صورت میں ان کے مجموعہ کلام ''فروزاں'' میں ملتا ہے۔ شاید جذبؔی نے اپنے دل کی اداسی کی وجہ سے پہلے اپنا تخلص ملالؔ رکھا تھا، جو بعد میں جذبؔی ہوگیا۔ جذبؔی نے ایک غزل ۱۹۳۳ء میں لکھی تھی جس کا ایک شعر دیکھئے......

مرنے کی دعائیں کیوں مانگوں، جینے کی تمنا کون کرے
یہ دنیا ہو یا وہ دنیا، اب خواہش دنیا کون کرے

......جذبؔی نے یہ شعر شاید بے حد مایوسی اور افسردگی کے عالم میں تخلیق کیا ہوگا، جس کی وجہ سے اس کے اندر ایک خاص درد و کرب ہے۔ یہ پوری غزل ایسے احساس و جذبات سے لبریز ہے جس کی ترجمانی شکست خوردہ دل ہی کرسکتا ہے......

جب کشتی ثابت سالم تھی ساحل کی تمنا کس کو تھی
اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنا کون کرے
دنیا نے ہمیں چھوڑا جذبؔی ہم چھوڑ نہ دیں کیوں دنیا کو
دنیا کو سمجھ کر بیٹھے ہیں اب دنیا دنیا کون کرے

......غزل سے یہ اشعار یقیناً جذبی کے مایوس و مغموم دل کی ترجمانی کرتے ہیں۔

جذبی نے اپنی شاعری میں الیاتی حقیقت پسندی اور احساس کو ہی اپنا فن سمجھا ہے۔ جس سے ان کا کلام کھوکھلی رجائیت، سستی رومانیت اور سطحیت سے پاک ہے۔ جب وہ ترقی پسند تحریک میں شامل تھے، اس وقت بھی انہوں نے ہنگامی اور ترغیبی ادب سے پرہیز کیا۔ ان کے کلام میں زندگی اور فطرت کے بے شمار پہلو نمایاں ہیں۔ جذبی کی حقیقت شناسی سے ایک عظیم شعری کائنات وجود میں آتی ہے۔ انہوں نے ''فروزاں'' کے دیباچے میں اپنے شعری نقطۂ نظر کی وضاحت بڑی خوبی سے کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں......

''ایک شاعر کی حیثیت سے ہمارے لئے جو چیز سب سے اہم ہے، وہ زندگی یا زندگی کے تجربات ہیں۔ لیکن کوئی تجربہ اس وقت تک موضوعِ سخن نہیں بنتا، جب تک اس میں شاعر کو جذبے کی شدت اور احساس کی تازگی کا یقین نہ ہو جائے۔ یہی دونوں چیزیں شاعر کو قلم اٹھانے پر مجبور کرتی ہیں......

......میں ہنگامی ادب کا زیادہ قائل نہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اِدھر ایک واقعہ ہوا اور اُدھر نظم تیار ہو گئی۔ یہ تو اس وقت ممکن ہے جب ذہن پہلے سے اس واقعہ کے لئے تیار ہو۔ تجربہ تخلیل کی منزل تک پہنچنے کے لئے تحلیل و تجربے کے مراحل سے نہیں گزرتا بلکہ شاعر کے مزاج سے بھی ہم آہنگ ہوتا ہے۔ اس کو ہضم کرنا اور رچانا بسانا بھی کہتے ہیں۔ اس کے لئے بعض اوقات کافی مدت درکار ہوتی ہے۔ جو حضرات رچانے بسانے کو غیر ضروری سمجھتے ہیں، ان کے یہاں گہرائی اور گیرائی کے بجائے جذباتیت اور سطحیت کا پیدا ہونا لازمی ہے۔''

مندرجہ بالا اقتباس سے جذبی کے نظریۂ شعر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ وہ شاعری اور حقائق دونوں سے اپنا دامن استوار رکھتے ہیں۔ اسی لئے جذبی نے ادبِ انسانیت کی پُرخلوص شاعری کی ہے۔ جذبی نے فوری طور پر موضوع کو فن کا جامہ نہیں پہنایا بلکہ تجربے کو شخصیت کا جزو بنایا اور پھر شعر کے قالب میں ڈھال دیا۔ یہی وجہ ہے کہ جذبی کی تخلیقات ان کے بہت سارے معاصرین کے مقابلے میں کم ہیں۔ ۱۹۲۲ء سے ۱۹۳۶ء تک جذبی کے کلام کا اگر جائزہ لیں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انہوں نے اس مدت میں ۳۲ر غزلیں اور ۷ر نظمیں کہی ہیں۔ غزلوں میں مجموعی اشعار کی تعداد تقریباً ۱۵۷ر ہے۔ ''فروزاں'' میں ۴۰ر غزلیں، ۱۴ر نظمیں، ۲ر رباعیاں اور ۸ر متفرق اشعار ہیں۔ ۱۹۲۹ء سے ۱۹۴۳ء تک پندرہ برس کا یہ کلام ہے۔ جذبی کی یہ ۴۰ر غزلیں ۳۵۶ر اشعار پر مشتمل ہیں۔ جذبی یقیناً کم سخن اور کم آمیز شاعر

ہیں۔ وہ اپنے کلام کا بڑی سختی سے محاسبہ کرتے ہیں۔ وہ خود کہتے ہیں......

''میں ہر سال اپنی بیاض اُٹھاتا تھا اور اس میں سے کچھ نہ کچھ کاٹ دیا کرتا تھا......یہ ٹھیک نہیں ہے، یہ بہت پھسپھسا ہے یا اس میں آورد بہت ہے...... وغیرہ وغیرہ۔''

جذبی اپنی کم گوئی کا اعتراف کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں......

''میں کم گو ہوں، اس میں کوئی شک نہیں ......لیکن جب تک مجھے کوئی Inspiration نہ ہو، کوئی ایسی چیز نظر نہ آئے جس میں تازگی ہو، اس وقت تک گاڑی چلتی نہیں۔ پھر وہی بات کہ زندگی کے جتنے تجربات ہیں، ان کو شعر بنانا کوئی آسان نہیں۔ جہت سے Common تجربے ہمارے آپ کے ہوتے ہیں جن کا کبھی ہم ذکر بھی نہیں کرتے۔ یہ اتنے عام ہیں کہ ہماری زندگی میں جس کی انتہا نہیں ہے۔ اب غالب نے کتنا کہا؟ کتنا بڑا دیوان ہے، جو ان کا انتخاب ہے؟'' (کتاب نما، دہلی، اکتوبر ۱۹۹۰ء، ص:۱۱۶)

جذبی نے سیدھے سادے انداز میں اپنے جذبات وخیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ اپنے کلام کی سادگی اور جذبے کی پاکیزگی کی وجہ سے اردو شاعری میں قاری کو متوجہ کرتے ہیں۔ جذبی کے کلام میں غم دوراں کے ساتھ ساتھ زندگی کے تلخ تجربات کی داستانیں بھی مل جاتی ہیں۔ ''فروزاں'' کی پہلی غزل کے مطلع کا شعر جب جذبی کا تعارف پیش کرتا ہے تو اس میں بھی غم کی تصویر نظر آتی ہے۔ مثلاً......

غم کی تصویر بن گیا ہوں میں
خاطر درد آشنا ہوں میں

......اور ضبط کا اشارہ کرتے ہوئے مقطع کا شعر دیکھئے......

ضبطِ غم بے سبب نہیں جذبی
خلش دل بڑھا رہا ہوں میں

ہمارے بہت سے ناقدین کا خیال ہے کہ جذبی کی شاعری پر فانی کا رنگ غالب ہے۔ لیکن میری رائے میں یہ درست نہیں۔ ان کی غزلوں میں وہ کیفیت نہیں ہے، جس کو فانی کا رنگ قرار دیا جائے۔ البتہ ان کی ایک غزل جو ۱۹۳۳ء میں لکھی گئی، کچھ اس طرح فانی کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے جیسے کہ جذبی کا مقطع بدل کر فانی کے کلام میں شامل کر دیا جائے تو پڑھنے والوں کے لئے فیصلہ کرنا کافی مشکل ہوگا کہ یہ غزل فانی کی نہیں ہے۔ مثال کے طور پر

غزل کے دو اشعار دیکھئے......

مرنے کی دعائیں کیوں مانگوں جینے کی تمنا کون کرے
یہ دنیا ہو یا وہ دنیا اب خواہش دنیا کون کرے
جب کشتی ثابت و سالم تھی ساحل کی تمنا کس کو تھی
اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنا کون کرے

جذبی نے ہمعصر ترقی پسند مصنفین کی طرح ادب کو سیاسی مقصد کے لئے استعمال نہیں کیا۔ انہوں نے اپنی شاعری کو سیاسی بلند آہنگی سے دور رکھا۔ جذبی کے علاوہ فیض، مجاز، جاں نثار اختر اور اختر الایمان بھی اسی گروہ کے شاعر ہیں۔ ترقی پسند تحریک کا بھی یہ مقصد نہیں رہا کہ وہ شعروادب میں سیاسی بلند آہنگی کو جگہ دے۔

جذبی کی حقیقت پسندی جب رومانیت سے ٹکراتی ہے تو ایک طرح کا درد و کرب ابھر کر سامنے آتا ہے۔ ۱۹۴۱ء میں جذبی نے ایک نظم ''موت'' لکھی تھی جو بے حد مقبول ہوئی۔ یہ نظم خود تخلیق کار کو کافی پسند تھی۔ ''موت'' عنوان ہونے کے باوجود اس نظم کے اندر جو نکات ملتے ہیں وہ کافی خوبصورت انداز میں ہیں۔ اس نظم کے مطالعے سے ایک نئی زندگی کا سراغ ملتا ہے۔ مجاز کی نظم ''آوارہ'' جہاں اردو شاعری کی اعلیٰ تخلیق ہے، وہیں جذبی کی نظم ''موت'' کمال فن کی سب سے اچھی مثال ہے۔

جب فنکار اپنے بنیادی تقاضوں کو نظر انداز کر دیتا ہے اور اشتراکی ادیب کی طرح سیاست ہی کو کائنات تصور کرنے لگتا ہے تو ادبی تقاضے مجروح ہو جاتے ہیں۔ جذبی نے کبھی ایسا نہیں کیا۔ ان کے یہاں زمانہ سازی کا انداز نہیں ملتا۔ OO

شاہد قمر آفریدی (علیگ)

میرے استادِ محترم...... معین احسن جذبؔی

ہم تھک کے گرے گر کے اٹھے اٹھ کے چلے بھی
تجھ پہ اثر اے دوریٔ منزل نہیں ہوتا

۱۹۶۴ء میں آرٹس فیکلٹی بن کر تیار ہو گئی تھی، لہٰذا پری یونیورسٹی پاس کرنے کے بعد آسمان منزل ایس۔ ایس۔ ہال سے کلاسیز نئی فیکلٹی میں منتقل ہو گئیں اور ہم لوگ سال اول بی۔اے میں آ گئے، اردو مضمون خصوصی تھا۔ لہٰذا اپنے وقت کی نامور ہستیوں قاضی عبدالستار، خلیل الرحمٰن اعظمی، پروفیسر ذوقی، پروفیسر مجنوں گورکھپوری، پروفیسر معین احسن جذبؔی اور مولانا نادر علی خان، عتیق احمد صدیقی، انصار اللہ خاں نظر، شہریار، شمیم حنفی، کوکب قدیر، نور الحسن، نعیم الحسن، اور راہی معصوم رضا نے پڑھایا۔ لکھنے لکھانے میں شروع سے دلچسپی رہی۔ اُن دنوں قاضی عبدالستار صاحب نے ''بزم راوی'' افسانہ نگاروں کی ایک انجمن بنائی تھی۔ مجھے یاد ہے جب پہلی مرتبہ میں نے ایک افسانہ پڑھا تو میری آواز کانپ رہی تھی اور سطریں نگاہوں سے اوجھل سی ہو رہی تھیں۔ خوب قہقہے لگے مگر قاضی صاحب نے محبت سے حوصلہ دلایا۔ افسانہ، کہانیاں، چائے کینٹین، گیمز، جمنازیم، طلبا کی یونین، سیاست میں اس درجہ الجھے کہ بی۔اے کرنا ہمارے لئے ہمالیہ پہاڑ بن گیا۔ ۱۹۷۵ء تک جذبؔی صاحب کا شاگرد رہا ہوں۔ وہ مجھے اپنی کلاس میں ہر سال دیکھ کر مسکراتے...... ''تم کبھی نہیں سدھرو گے، خواہ مخواہ باپ کا پیسہ برباد کر رہے ہو۔'' خلیل الرحمٰن اعظمی کی چشمک قاضی عبدالستار صاحب سے چلتی تھی۔ قاضی صاحب کے شاگرد ہونے کے ناطے طنز کرتے...... ''یہ کہانیاں، افسانے تمہیں کچھ نہیں دیں گے۔ اگر بدمعاش ہی بننا ہے تو بڑے بدمعاش بنو۔'' پروفیسر نذیر احمد صاحب کو جب ایک ہفتہ وار اردو اخبار ''انحراف'' کا پرچہ دیا جو راقم الحروف اور نازش انصاری کی ادارت میں نکلتا تھا، تو نذیر صاحب مسکراتے ہوئے بولے...... ''یہ سب چھوڑو، تعلیم کی طرف توجہ دو۔'' بیشتر استاد ایک ہی کلاس میں بار بار دیکھ کر مسکراتے اور جملہ کستے۔ جذبؔی صاحب بڑے تحمل

سے کہتے ...... اماں تم اپنے باپ کا پیسہ کیوں برباد کر رہے ہو۔ کیا اور کوئی کام نہیں ہے۔ جذبی صاحب ایک شفیق استاد تھے۔ وہ اپنے کام سے کام رکھتے تھے۔ ان کے پاس فضول بکواس باتوں کے لئے وقت نہ تھا۔ مشاعروں میں بھی کم جاتے۔ آخیر عمر کے حصہ میں تو بالکل آنا جانا چھوڑ دیا تھا۔ ایک زمانہ میں فیض احمد فیض پاکستان سے آئے تھے۔ ان کے اعزاز واستقبالیہ میں ایک میٹنگ آرٹس فیکلٹی آف لاؤنج میں ہوئی تھی، اس وقت ایک یادگار منظر جو بڑا ہی رقت آمیز تھا، کہ جب جذبی اور فیض گلے ملے تھے، بس ایک دوسرے کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے، نہ فیض کچھ کہہ رہے تھے اور نہ ہی جذبی صاحب۔ بس آنسوؤں کی زبان میں ایک دوسرے کے درد وکرب اور جذبات کی ترجمانی ہو رہی تھی۔

جذبی صاحب زیادہ تر شیروانی یا پاجامہ زیب تن کرتے جس میں وہ شرافت کا مجسمہ لگتے، ہونٹوں میں سگار دبا ہوا اور کلاس میں ٹہل ٹہل کر پڑھاتے۔ ایک دن میں نے جذبی صاحب سے کہا کہ سب کو وظائف وغیرہ ملتے ہیں، لیکن جو آپ کے شاگرد ہیں وہ راندۂ درگاہ ہیں۔ مسکرا کر بولے، درخوست لاؤ۔ بی۔اے میں ایک مضمون اسلامک اسٹڈیز کا تھا تو وہاں کے ہیڈ آف دی ڈپارٹمنٹ پروفیسر اقبال انصاری کو خط لکھ دیا۔ چند دنوں بعد دیکھا کہ درخواست منظور ہے۔ لہٰذا وظیفہ مل گیا اور خوب یار لوگوں میں چائے کے دور چلے۔ ۱۹۶۶ء میں ایک دن میں نے جذبی صاحب سے کہا، ''جذبی صاحب، اپنی کوئی غزل دے دیجئے''۔ بولے کیا کروگے۔ میں نے کہا کہ ماہنامہ ''سنگریزہ'' نکالنا ہے، اس کے لئے چاہئے۔ تو قہقہہ لگا کر بولے...... اماں یار تم پہلے ہی کیا کم پتھر پھینکتے تھے جو اب پھینکوگے؟ بات بڑی پُرلطف کہتے۔ خود بھی ہنستے دوسروں کو بھی ہنساتے۔ ۱۹۷۰ء کے آس پاس کی بات ہے کہ ایک دن جذبی صاحب ابن فرید صاحب کے ساتھ شیشم کے جھنڈ کے نیچے ہسٹری ڈپارٹمنٹ کے سامنے کھڑے محو گفتگو تھے۔ اتفاق سے اس دن میرے ساتھ جذبی صاحب کے پرانے ایک شاگرد تھے، جو ذکاء الرب اور شہریار، معصومہ کاظمی اور احسن نشاط کے گروپ میں سے تھے اور مولوی عبدالحق بابائے اردو پر ان کے انڈر میں ریسرچ بھی کی تھی۔ میں نے کہا آپ جذبی صاحب سے میرے لئے حیات اللہ انصاری اردو بورڈ کو ایک سفارشی خط لکھوا دیں۔ تو انہوں نے جذبی صاحب سے کہہ دیا۔ مگر جذبی صاحب کی ٹال مٹول پر بولے، آپ تو کسی کی کٹی انگلی پر پیشاب نہیں کرتے۔ یہ تو آپ کے شاگرد ہیں اور میں بھی آپ کا پرانا شاگرد ہوں جسے آپ نے زندگی بھر آل احمد سرور سے لڑوایا، جس کے عوض میں آج تک ڈاکٹریٹ کی ڈگری نہیں مل پائی۔ ابن فرید صاحب جذبی صاحب کی طرف سے بولے۔ ''آپ کو جذبی صاحب سے ایسا

نہ کہنا چاہئے۔'' وہ بولے، آپ کی صرف دوستی ہے اور شاگرد استاد کا رشتہ دوستی سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔ جذبی صاحب سے جتنا ہم پیار کرتے ہیں، آپ کو کس پیمانہ سے دکھائیں۔ جذبی صاحب بڑے وضع دار انسان تھے۔ جس کے دوست تو اس کے لئے سب کچھ لٹا دیں اور جس سے تعلقات نہیں اس کے لئے کچھ بھی نہیں۔ اکثر ان کے ہمعصر دوستوں ساتھیوں سے چشمک رہتی۔ ایک واقعہ اس سلسلہ میں یاد آیا۔ جمنا پرساد راہی، جو مختار ہاشمی کے شاگردوں میں سے ہیں، ایک ملاقات کے دوران جذبی صاحب کے موضوع پر اختر انصاری مرحوم کا لطیفہ سنانے لگے کہ میں اختر انصاری کے ساتھ تھا کہ دیکھا جذبی صاحب چھتری لگائے جا رہے ہیں تو انہوں نے کہا، دیکھیں جذبی صاحب چھتری لگائے جا رہے ہیں اور آپ چھتری کے بغیر ہیں۔ اختر انصاری اور جذبی صاحب میں آپسی چشمک بھی تھی۔ اس کے سبب اختر انصاری بولے۔ ان کی کھال تو موٹی ہے، میری تو نہیں۔ یہ ان کے ہمعصر ساتھیوں کی باتیں ہیں کہ اختر انصاری کی شخصیت بھی بڑی رنگین واقع ہوئی تھی جس کے سبب ان کا لباس، عینک، جوتے، موزے، اور رومال تک رنگین ہوتا تھا۔ جس طرح جذبی صاحب سگار پینے کے شوقین تھے، اُسی طرح اختر انصاری پائپ کے شائق تھے۔ ان کے ڈرائنگ روم میں درجنوں مختلف قسم کے تمباکو پینے کے پائپ ڈرائنگ روم کی شیشے کی الماری میں نظر آتے۔

جذبی صاحب سے ایک دن میں نے یوں ہی مجاز کے لئے پوچھا۔ مسکرائے، ارے وہ ہمارے سامنے لونڈا تھا۔ جذبی صاحب مجروح کے بہت مداحوں میں تھے۔ جذبی صاحب اپنے شاگردوں سے پیار کرتے تھے، ریٹائرمنٹ کے بعد جذبی صاحب جب کہیں شاہراہ پر ٹہلتے یا بنک وغیرہ میں مل جاتے تو میری خیریت پوچھتے، ملازمت کی نسبت سے جامعہ اردو کی خیریت دریافت کرتے اور اپنے پرانے شاگرد غیور عالم کی بابت معلوم کرتے، کیسے ہیں؟ کہتے، اُسے کسی دن گھر لے کر آنا۔

جب کسی کام سے جامعہ اردو انور سعید کے پاس آنا ہوتا تو میرے پاس آکر ضرور بیٹھتے، خیریت پوچھتے، ان کی وضعداری کی جو صفت تھی۔ ایک مرتبہ (رجسٹرار جامعہ اردو) انور سعید دفتر میں کچھ زیادہ دیر تک محو گفتگو رہے۔ جذبی صاحب کی اطلاع پر اندر نہیں بلایا۔ جذبی صاحب بڑے تحمل سے انتظار کی گھڑیاں گنتے رہے۔ بھلا جذبی صاحب کو انتظار کی تاب کہاں؟ غصے سے تلملائے جا رہے ہیں۔ مجھ سے بولے، اب کبھی یہاں نہیں آؤں گا۔ واقعی وہ بات کے دھنی اور اپنے ارادے کے پکے تھے۔ اس دن سے جامعہ اردو میں قدم نہیں رکھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ مزاج کے اکل کھرے تھے تو یہ غلط ہوگا۔ ان کی طبیعت خاموش پسند تھی۔ بے جا

تعریف وتوصیف پسند نہ کرتے تھے اور نہ ہی واہ واہ کے ڈونگرے برساتے۔ موجودہ شاعروں کو پیشہ ور اور مشاعروں کو نوٹنکی کہتے، اسی لئے جانا چھوڑ دیا تھا۔ ایک دن میں نے جذبی صاحب سے کہا، یہ پاکستان والے آپ کی غزل بڑے طمطراق سے ریڈیو پر سنواتے ہیں......
''مرنے کی دعائیں کیوں مانگوں جینے کی تمنا کون کرے......'' مگر مقطع میں آپ کا نام تخلص غائب کرکے ''اے جذبی'' کی جگہ ''اے دل'' کردیا ہے...... کہنے لگے، مجھے بھی دو ایک میرے دوستوں نے بتلایا ہے۔ بس ان قزاقوں کے بارے میں کیا کہا جائے۔ پاکستان جانا ہوا تو وہاں کے بااثر لوگوں سے شکایت کروں گا۔
جذبی صاحب کی شخصیت سے ایک کثیر تعداد اہل علم وفن کی متاثر تھی۔ ۱۹۹۱ء میں آگرہ ریڈیو اسٹیشن جانا ہوا تو وہاں اردو شناس گھرانے گورکھپور کے ایک فرد عباسی نے، جو پروگرام ایگزیکیٹو تھے، کہا کہ کسی دن علی گڑھ ہمارا انٹرویو جذبی صاحب سے ریکارڈ کرا دیجئے۔ میں نے کہا آپ کے ایک دوست طارق صاحب، جو شعبہ اردو سے منسلک ہیں اور کبھی گورکھپور ریڈیو سے وابستہ رہے ہیں، ان سے مل لیں تو اور بھی اچھا رہے گا کیوں کہ وہ بھی جذبی صاحب کے شاگردوں میں سے ہیں۔ مگر جذبی صاحب ان چیزوں کو شوبازی کہتے تھے۔ زندگی میں ان کو عالمگیر شہرت حاصل ہوگئی تھی۔ وہ نمائش ونمود سے کوسوں دور تھے۔ ان کے شاگردوں کی تعداد تو بہت ہے، جنھوں نے معراج فن کمال حاصل کیا۔ اُن میں ہمارے دوست ابوالکلام قاسمی، سید اشرف امین، سید ہاشم وغیرہ شعبۂ اردو سے وابستہ ہوکر ان کے نام کے چراغ روشن کررہے ہیں۔
جذبی صاحب کے انتقال کی خبر نے دل کو پُر ملال بنا دیا ہے۔ تعزیت کے لئے سرسید نگر، فروزاں رہائش گاہ پر سہیل جذبی استاد محترم کے ہمراہ سید محمد اشرف (انکم ٹیکس کمشنر) بھی آئے ہوئے تھے۔ ہم لوگ دیر تک خاموش آنسوؤں کی زبان میں جذبی صاحب کو یاد کرتے رہے کہ سید محمد اشرف بھی جذبی صاحب کے شاگردوں میں سے رہے ہیں۔ دوران گفتگو جذبی صاحب کا ایک پرلطف واقعہ ان کے صاحبزادہ سہیل جذبی (جو اُن دنوں شعبۂ انگریزی میں پروفیسر ہیں) نے بتایا کہ گرنے سے جذبی صاحب کی ٹانگ میں فریکچر ہوگیا تھا تو میڈیکل میں زیر علاج تھے۔ کئی نرسیں خوش شکل مسکراتی اُن کے پاس پہنچیں تو جذبی صاحب بولے...... ''یہ کیوں آئی ہیں؟'' سہیل نے کہا کہ آپ کا ٹمپریچر ناپنے آئی ہیں، تو جذبی صاحب مسکرا کر بولے۔ ''اماں یہ ٹمپریچر ناپنے آئی ہیں یا بڑھانے آئی ہیں؟'' افسوس کہ ایک عظیم شاعر اردو ادب سے اٹھ گیا جو ترقی پسند تحریک کی آخری کڑی تھا۔ کاش کہ اردو داں طبقہ اور اردو اکادمی ان کی یاد میں جشن جذبی کا اہتمام کرتے!! ○○

مرغوب علی

جذبی: ایک منفرد فنکار

معین احسن جذبی ترقی پسندوں میں اس لئے اپنی جداگانہ حیثیت اور شناخت رکھتے ہیں کہ وہ جماعتی نقطۂ نظر سے مختلف سوچ اور اپنی شناخت الگ بنانے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ اپنے پہلے مجموعہ کلام ''فروزاں'' کے دوسرے ایڈیشن میں (جو پہلی بار ۱۹۴۳ء اور دوسری بار ۱۹۵۱ء میں) وہ رقم طراز ہیں......

''ہمارے لئے مارکسی نقطۂ نظر پیدا کرنا نہایت ضروری ہے۔ اگر ہم واقعی اپنے آپ کو ترقی پسندی کا علمبردار کہتے ہیں، لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ مارکس کے نظریات کو رنگین یا پُر شوکت الفاظ میں نظم کر دیا جائے۔ ایک شاعر کی حیثیت سے ہمارے لئے جو چیز سب سے زیادہ اہم ہے، وہ زندگی یا زندگی کے تجربات ہیں۔ لیکن کوئی تجربہ اس وقت تک موضوعِ سخن نہیں بن سکتا جب تک اس میں شاعر کو جذبے کی شدت اور احساس کا یقین نہ ہو جائے۔

یہ زمانہ سیاسی ہنگاموں کا ہے۔ ہمارے بعض ترقی پسند شاعر جو کسی جماعت سے بھی منسلک ہیں، یہ حضرات اپنی جماعتی وفاداری کی رَو میں صرف وہی دیکھتے اور سوچتے ہیں جو ان کی جماعت دیکھتی اور سوچتی ہے۔ انہیں اس سے غرض نہیں کہ ان کی جماعت کی پالیسی غلط ہے یا صحیح۔ مثال کے طور پر ۱۹۴۷ء کا زمانہ لیجئے، جب ہندوستان آزاد ہوا تھا۔ اُس وقت بعض شاعروں نے اپنی جماعت کی پالیسی کی بناء پر آزادی کی مدح میں نظمیں لکھیں۔ لیکن ان کی جماعت کی پالیسی تبدیل ہوئی تو یہی شاعر فریب آزادی کے عنوان سے نظمیں لکھنے لگے۔ سیاست میں ''مصلحت'' کو بہت دخل ہے، لیکن مصلحت پر شعر کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی۔ مصلحت میں جزوی صداقت ہوتی ہے، شاعری کامل صداقت چاہتی ہے۔

(''فروزاں'' کا دیباچہ)

جذبی کی ادبی تگ و دو کا زمانہ ۱۹۲۹ء کے آس پاس کا ہے۔ اُن کی غزل جو اُن کے مجموعے ''فروزاں'' میں پہلے نمبر پر ہے، اس کا انداز کچھ یوں ہے......

غم کی تصویر بن گیا ہوں میں　　　خاطر درد آشنا ہوں میں

یہ وہ مروجہ لہجہ اور الفاظ ہیں جو فانی، اصغر اور جگر مرادآبادی کے یہاں اُن دِنوں چلن میں تھے۔ لیکن ''فروزاں'' کی تیسری غزل میں وہ کہتے ہیں......

سنبھلنے دے ذرا بیتابیٔ دل　　　نظر آتے ہیں کچھ آثارِ منزل

یہاں سے ان کے یہاں بازگشت سے بچالے جانے کی پرچھائیاں لفظوں کے در و دیوار پر چلتی پھرتی نظر آنے لگتی ہیں۔ ''فروزاں'' کے دیباچے میں انہوں نے جس جماعتی نقطۂ نظر سے اختلافِ رائے کا اظہار کیا ہے، وہ بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اپنی راہیں تلاش رہے تھے اور جماعت کے ہنگاموں کی گرد میں انہیں اپنا آسمان، اپنے ستارے اور اپنا چاند الگ کر کے وہ شاعری کرنی تھی جو وہ کر گئے۔ ان کی ایک غزل بہت مشہور ہے......

مرنے کی دعائیں کیوں مانگوں جینے کی تمنا کون کرے
یہ دنیا ہو یا وہ دنیا اب خواہش دنیا کون کرے
جب کشتی ثابت و سالم تھی، ساحل کی تمنا کس کو تھی
اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنا کون کرے
دنیا نے ہمیں چھوڑا جذبی، ہم چھوڑ نہ دیں کیوں دنیا کو
دنیا کو سمجھ کر بیٹھے ہیں، اب دنیا دنیا کون کرے

اپنی شاعری کی ابتداء میں انہوں نے اپنا تخلص ملالؔ رکھا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب آگرہ میں فانیؔ بھی موجود تھے، پھر فانیؔ حیدرآباد چلے گئے اور وہ، معین احسن ملالؔ سے معین احسن جذبیؔ بن گئے۔ ''دنیا نے ہمیں چھوڑا جذبی اب دنیا دنیا کون کرے'' میں جہاں ایک مایوسی کی جھلک محسوس ہو رہی ہے، وہاں ان کا حوصلہ بھی چمک رہا ہے۔ ''فروزاں'' کے بعد ان کا ایک مجموعہ ''سخن مختصر'' کے نام سے آیا تھا، جس کا سنِ اشاعت ۱۹۶۰ء ہے۔ اس کے بعد انہوں نے ''فروزاں'' کا کچھ نئی چیزوں کے ساتھ نیا نام ''گدازِ شب'' رکھ کر ۱۹۸۵ء میں مکتبہ جامعہ، نئی دہلی سے چھپاوایا۔

معین احسن جذبیؔ اور اسرارالحق مجازؔ کا رات دن کا ساتھ تھا۔ فیضؔ، مجروحؔ، اخترالایمانؔ، جاں نثار اخترؔ اور دوسرے ترقی پسند شاعروں کی شہرتیں بھی اس وقت بامِ عروج پر تھیں، مگر جذبی کا لہجہ، ان کے لفظوں کا انتخاب اور لفظوں کو برتنے کا طریقہ اور سلیقہ دوسروں سے مختلف ہے۔

ان کے یہاں ان دنوں بہت زیادہ مقبول تلازمے بھی نہ کے برابر ہیں۔ فیض کی شہرت اور مقبولیت نے کتنے ہی شعراء کے مشہور شعر اپنے نام لکھوالئے۔ خاص کر مجروح سلطانپوری اور دوسرے کئی ترقی پسند شعراء کے شعر فیض کے نام سے مشہور چلے آتے ہیں۔ لیکن جذبی اس سلسلے میں بھی خوش نصیب رہے کہ ان کے شعر ہمیشہ الگ سے پہچانے جاتے رہے ہیں۔ ان کا کل کلام بے حد مختصر تخلیقات پر مبنی سہی، لیکن ان کے ہر شعر سے ان کے خونِ جگر کی بو اور ان کے عرضِ ہنر کا احساس جاگتا ہے۔ ان کے کچھ شعر......

گریۂ پیہم پہ میرے مسکراتا ہے کوئی
اللہ اللہ کتنی رنگینی ان افسانوں میں ہے

مسکرا کر ڈال لی رخ پر نقاب
مل گیا جو کچھ کہ ملنا تھا جواب

زندگی ہے تو بہرحال بسر بھی ہوگی
شام آئی ہے تو آئے کہ سحر بھی ہوگی

عشق کی معصومیت کا یہ بھی اک انداز تھا
ہم نگاہِ لطفِ جاناں سے بھی شرمایا کئے

اے حسن ہم کو ہجر کی راتوں کا خوف کیا
تیرا خیال جاگے گا سویا کریں گے ہم

غموں کی دنیا کو روند ڈالیں، نشاطِ دل پائمال کر لیں
نئی محبت، نیا جنوں ہے، خدایا کیا اپنا حال کر لیں

اک بار اور دیکھا حسرت سے ان کی جانب
پھر رفتہ رفتہ ان سے بیگانہ ہو گیا میں

اس حرص و ہوس کی دنیا میں ہم کیا چاہیں ہم کیا مانگیں
جو چاہا ہم کو مل نہ سکا جو مانگا وہ بھی پا نہ سکے

سمجھائیں کیسے دل کی نزاکت کا ماجرا
خاموشیِ نظر کی خطابت کہاں سے لائیں

ہاں، اک نگاہِ لطف کے حقدار تھے ضرور
مانا کہ تھے، قابلِ صد التفات ہم

ان کی بہت ساری نظمیں بھی اپنی معیاری حیثیت میں اُن دنوں کی نظموں میں جدا مقام

رکھتی ہیں۔ خاص طور پر ''مطربہ''، ''ہلالِ عید''، ''حسنِ برہم''، ''فطرت ایک مفلس کی نظر میں''، ''موت''، ''طوائف''، ''نیا سورج''، ''میری شاعری اور نقاد''، ''آل احمد سرور کی خدمت میں''، فیض اور سجاد ظہیر کی گرفتاری پر ''چشم سوال'' اور دوسری نظمیں۔ ان کے بارے میں خلیل الرحمٰن آعظمی نے بہت ہی پچی بات کہی ہے......

''ان کا کلام شروع سے آخر تک ایک ہموار شخصیت کے ذہنی ارتقاء کا ترجمان ہے۔ ان کی غزلیں جن کیفیات یا جن تجربات کی عکاسی کرتی ہیں، ان میں تکمیل ہے۔ اس لئے انداز بیان میں کہیں سے ابہام یا انتشار نہیں پیدا ہوتا اور وہ ادبی پیکر میں اس طرح ڈھل جاتی ہیں کہ ان کی تاثیر اور دلکشی میں محکمی آجاتی ہے۔ جذبی کے تجربات میں وسعت نہ ہو، لیکن گہرائی ضرور ہے۔ انہوں نے زندگی کے مختلف مظاہر اور سماجی زندگی کی متنوع حقیقتوں تک رسائی حاصل نہیں کی، لیکن ان کا کارنامہ یہ ہے کہ تجربات کی جو متاع ان کے ہاتھ لگی ہے، اسے انہوں نے سلیقے کے ساتھ شعر کے سانچے میں ڈھالا ہے۔'' (''اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک''، خلیل الرحمٰن آعظمی، ایڈیشن: ۱۹۹۶ء، صفحہ: ۱۳۳)

OO

معین احسن جذبی: ایک نظر میں

نام : معین احسن جذبی

پیدائش : ۲۱؍اگست ۱۹۱۲ء

مقام پیدائش: قصبہ مبارک پوری، ضلع اعظم گڑھ (یو۔پی)

تخلص : پہلا تخلص ملال، دوسرا اور آخری تخلص جذبی

تعلیم : ایم۔اے ۱۹۴۰ء، پی۔ایچ۔ڈی۔ (اردو) ۱۹۵۶ء، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

ابتدائی تعلیم: ہائی اسکول، جھانسی۔

ایف۔ایس۔سی سینٹ جانس کالج، آگرہ، ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۱ء تک

بی۔اے اینگلو عربک کالج (ذاکر حسین کالج)، دہلی، ۱۹۳۶ء سے ۱۹۳۸ء تک

ملازمت : ۱۔ اتر پردیش سکریٹیریٹ، لکھنؤ میں مترجم (مدتِ ملازمت چار مہینے)

۲۔ ۱۹۳۸ء میں مہاراشٹرا سکریٹریٹ بمبئی میں مترجم

۳۔ اگست ۱۹۴۳ء سے فروری ۱۹۴۵ء تک نائب مدیر رسالہ ''آجکل''

۴۔ ۱۹۴۵ء سے مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے شعبۂ اردو میں لکچرر اور ۱۹۶۱ء میں ریڈر۔

ملازمت سے سبکدوشی: ۲۱؍اگست ۱۹۷۴ء

شعری تصانیف: ۱۔ فروزاں، ۲۔ سخن مختصر

نثری تصانیف: ۱۔ حالی کا سیاسی شعور (دراصل یہ جذبی کے پی۔ایچ۔ڈی کا مقالہ ہے۔)

۲۔ طلسم ہوش ربا (نامکمل اور غیر مطبوعہ)

۳۔ خودنوشت سوانح (زیر تصنیف)

اعزازات : ۱۔ غالب ایوارڈ

۲۔ امتیازِ میر
۳۔ مہاراشٹر اردو اکیڈمی ایوارڈ
۴۔ ہریانہ اردو اکیڈمی ایوارڈ
۵۔ اقبال سمان
۶۔ اعزازِ غالب (غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی نے ۲۵/اکتوبر ۲۰۰۰ء کو ان کی ادبی خدمات کی بنا پر اعزاز سے نوازا۔)

○○

سفر کہانی

احمد آباد کے ریلوے اسٹیشن سے باہر نکل کر ایک نظر میں نے سامنے دیکھا۔ سب کچھ حسبِ معمول تھا...... بسیں، آٹو رکشا، اسکوٹر، موٹر سائیکل، کاریں اور پیدل چلنے والوں کی بھیڑ...... میرے لئے احمد آباد دیکھا بھالا شہر تھا۔ سڑکیں، گلیاں، ہوٹل اور سنیما گھر سب جانے پہچانے۔ متعدد مرتبہ میں یہاں آچکا تھا۔ لیکن اس بار جب میں اسٹیشن سے باہر آیا تو بے وجہ ہی میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ گو کہ گرمی کچھ خاص نہ تھی پھر بھی میں پسینے پسینے ہو رہا تھا۔ سوٹ کیس زمین پر رکھ کر میں نے ایک آٹو رکشا والے کو اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔ اس سے پہلے کہ آٹو رکشا میرے پاس آتا، ایک پولیس والا کندھے پر رائفل رکھے ہوئے میرے پاس سے گزرا۔ میں اسے دیکھ کر کچھ اس طرح اپنی جگہ سے ہٹا جیسے کوئی درندہ میرے پاس سے گزرا ہو۔ آٹو رکشا میں سوار ہوتے وقت میں نے آٹو والے کو غور سے دیکھا...... اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے ایک نظر سامنے کی پلیٹ کو بھی دیکھا جہاں اکثر آٹو رکشا میں ۷۸۶، رام یا عیسیٰ کی تصویر بنی ہوتی ہے۔ لیکن اس آٹو میں ایسا کچھ نہ تھا۔ آٹو والا مجھے نسبتاً شریف آدمی معلوم ہوا۔ اس نے آٹو اسٹارٹ کیا اور بولا۔ ”صاحب، کدھر جانے کا ہے؟“

”ریلیف روڈ، ہوٹل راجن۔“ میں نے جواب دیا۔

فاصلہ کچھ خاص نہ تھا لہٰذا جلدی ہی ہم ہوٹل راجن پہنچ گئے۔ میں نے اپنا سوٹ کیس اُٹھایا، آٹو والے کو پیسے دئے اور ہوٹل کے Reception پر پہنچ گیا۔ Reception Clerk نے ایک نظر مجھے دیکھا اور بولا۔ ”کیا روم مانگتا کیا سر؟“

میں نے "Yes" کہا تو کلرک نے جواب دیا۔

”سوری سر، روم Vaccant نہیں ہے۔“

”میں آپ کا بہت پُرانا Customer ہوں۔ میں جب بھی احمد آباد آتا ہوں، آپ ہی کے ہوٹل میں ٹھہرتا ہوں۔ آپ مجھے Adjust کیجئے۔ کچھ گنجائش نکالئے جناب۔“

''وہ تو ٹھیک ہے سر، لیکن ابھی کوئی روم خالی نہیں ہے۔ یہاں بازو میں کئی ہوٹل ہیں۔ آپ وہاں معلوم کیجئے، وہاں آپ کو روم مل جائے گا۔''

میں نے مجبوراً اپنا سوٹ کیس اُٹھایا اور ہوٹل سے باہر آ گیا۔ کچھ دور پیدل چلنے کے بعد میری نظر ہوٹل گرین پیلیس پر پڑی۔ ہوٹل نیا بنا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ لہٰذا میں اس کے Reception پر پہنچ گیا۔ Reception Clerk سے میں نے کہا۔

''ایک روم چاہئے۔''

''آپ اکیلے ہی ہیں یا کوئی اور بھی آپ کے ساتھ ہے؟'' کلرک نے پوچھا۔

میں نے کہا۔ ''میں اکیلا ہی ہوں۔''

اس نے بہت وزنی رجسٹر دراز سے نکالا اور کاؤنٹر پر رکھ دیا جو کہ مسافروں کی Entry کا رجسٹر تھا۔ میں نے جیب سے نظر کا چشمہ نکالا، آنکھوں پر لگایا اور رجسٹر میں اپنی آمد کا اندراج کرنے لگا۔ پہلے خانے میں، مسافر کا نام و پورا پتہ، اس کے بعد باپ کا نام، پھر کہاں سے آئے ہیں؟ کہاں جانا ہے؟ Nationality کیا ہے؟ وغیرہ وغیرہ...... اتنے خانے تھے کہ مجھے حیرت ہوئی۔ جب میں اپنا نام و پتہ لکھ چکا تو Reception Clerk نے مجھے غور سے دیکھا اور بولا۔

''آپ پہلے کالم کو ہی پوری طرح بھر دیجئے، باقی میں خود بھر لوں گا...... اور یہ ایڈوانس کی رسید لیجئے۔'' ایڈوانس کی رسید میں نے پکڑی اور کلرک سے کہا۔

''پہلا کالم تو میں بھر چکا ہوں۔''

''نہیں صاحب، آپ نے W. M. Chaudhary لکھا نہ، تو .W.M سے کیا بنتا ہے، یہ پورا لکھیے۔''

''کمال ہے...... میرا نام .W.M ہے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ .W.M کی فل فارم بھی لکھی جائے۔''

''فرق پڑتا ہے صاحب...... Specially احمد آباد میں تو بہت فرق پڑتا ہے۔''

''میں احمد آباد آتا رہتا ہوں اور راجن ہوٹل میں ٹھہرتا ہوں۔ راجن ہوٹل کے علاوہ بھی کئی بار دوسرے ہوٹلوں میں ٹھہرا ہوں، لیکن مجھ سے کبھی کسی نے یہ نہیں کہا کہ .W.M سے کیا بنتا ہے؟ اس کی فل فارم لکھیے۔''

''بحث کی ضرورت ہی نہیں ہے صاحب۔ آپ یا تو پورا نام لکھیے یا پھر کسی اور ہوٹل میں چلے جایئے۔'' کلرک نے قطعیت کے ساتھ روکھے پن سے کہا تو میں بغلیں جھانکنے لگا اور

احمقوں کی طرح اسے گھورنے لگا...... کلرک کے سر کے اوپر، تقریباً دیوار کے بیچ میں بہت ہی باریک اور سنہرے لفظوں میں لکھی اور سنہرے فریم میں جڑی مجھے ایک قرآنی آیت نظر آئی تو مجھے لگا کہ یہ مسلم ہوٹل ہے۔ لہٰذا میں نے مسافروں کے اندراج والا رجسٹر اپنی طرف کھینچا اور W.M. کی جگہ ولی محمد لکھ دیا...... کلرک نے ایک نظر مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا اور رجسٹر کے باقی کالم بھرنے کے بعد کہنے لگا۔

''ولی محمد بھائی، آپ کچھ خیال مت کیجئے گا۔ دراصل یہاں کی پولیس بہت حرامی ہے۔ آئے دن سالے بے وجہ ہوٹل کی چیکنگ کو آتے رہتے ہیں۔ سب سے پہلے رجسٹر ہی دیکھتے ہیں...... چونکہ یہ مسلم ہوٹل ہے، اس لئے بھی پولیس والے اکثر بے وجہ چیکنگ کو آجاتے ہیں اور تنگ کرتے ہیں۔ یہاں کی پولیس بہت متاسب اور زہریلی ہے۔ خدا انہیں غارت کر دے۔''

کلرک کی باتیں سن کر میں نے اس سے پوچھا۔ ''جناب آپ کا نام کیا ہے؟''

''میں اکبر علی احمد علی لوکھن والا ہوں۔'' اس نے کہا۔

''یعنی آپ اکبر بھائی ہیں۔''

''جی ہاں۔''

''ایسا ہے اکبر بھائی...... ہمیں ان کا تعصب، ان کا زہر اور ان کا کمینہ پن تو آسانی سے نظر آجاتا ہے۔ لیکن ہم اپنا احتساب کبھی نہیں کرتے۔ یعنی ہمیں اپنا زہر کبھی نظر نہیں آتا۔''

''کیا مطلب ہے آپ کا؟'' اکبر نے پہلو بدل کر بے چینی سے پوچھا تو میں نے کہنا شروع کیا۔

''آپ اپنے ہی کو دیکھئے...... ترکی ہوئی بے ڈھنگی داڑھی، خوفناک مونچھیں، بے ترتیب بال، ملگجے کے رنگ کی شلوار قمیض...... خدانہ خواستہ آپ کے کندھے پر A.K.47 اور رکھ دی جائے تو ایسا لگے گا جیسے آپ ابھی ابھی دریائے خیبر پار کر کے آئے ہیں...... جبکہ اکبر بھائی، داڑھی مدبرانہ متانت کی علامت تھی، لیکن ہم لوگوں نے اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم لوگوں نے اسلام کی روح کو سمجھا ہی نہیں۔ آج مسلمان ہندوؤں سے خوفزدہ ہیں تو ہندو مسلمانوں کی بنیاد پرستی سے، اور بدنصیبی یہ ہے کہ دونوں طرف احیاء پرست سیاسی اور مذہبی رہنما بنے ہوئے ہیں۔ اسی لئے ہندو اور مسلمانوں کے بیچ کھائی گہری ہوتی جا رہی ہے اور مکالمہ صفر ہوتا جا رہا ہے۔''

''اے کانیا...... صاحب کا سامان روم نمبر ۲۰۲ میں لے جا کر رکھ...... جاؤ صاحب، کسی چیز

کی ضرورت ہو تو نوکر کو بتا دینا۔''

نوکر میرا سوٹ کیس اور کمرے کی چابی لے کر چل دیا۔ شاید اکبر بھائی کو میری باتیں ناگوار لگیں، میں اپنا سا منہ لے کر رہ گیا اور نوکر کے پیچھے پیچھے اپنے روم کی طرف چل دیا۔

روم میں پہنچ کر میں نہایا، کپڑے بدلے اور گرم گرم چائے پینے بیٹھ گیا۔ سفر کی جسمانی اور ذہنی تھکن دور ہوئی تو سوچا کہ Patel & Sons سے مل کر یقیناً تازگی کا احساس ہوگا، کہ پٹیل اینڈ سنس کے مالک شمبھو بھائی سے میرے بہت شاندار تعلقات ہیں اور ہم دونوں کے درمیان پرانا کاروباری رشتہ بھی ہے۔ لہٰذا میں ہوٹل سے باہر آیا، آٹو رکشا پکڑا اور پٹیل اینڈ سنس کے یہاں پہنچ گیا۔ شمبھو بھائی اپنی کرسی پر بیٹھے کچھ کاغذات الٹ پلٹ کر رہے تھے۔ میں نے ان کو آداب کیا تو انہوں نے اپنا چہرہ اوپر اُٹھا کر مجھے دیکھا۔ میں نے تپاک سے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ لیکن شمبھو بھائی نے سرد مہری...... بلکہ کسی قدر بے اعتنائی کے ساتھ مجھ سے ہاتھ ملایا اور میری آمد پر ذرا بھی خوشی کا اظہار نہ کیا۔ ہاتھ ملا کر وہ پھر اپنے کاغذات دیکھنے لگے۔ مجھ سے بیٹھنے تک کو نہیں کہا۔ میں اسی طرح کھڑا رہا اور سوچنے لگا کہ آخر کیا بات ہے؟ کیا شمبھو بھائی مجھ سے ناراض ہیں؟ لیکن کیوں؟ کچھ دیر کے بعد شمبھو بھائی نے اپنا سر اوپر کیا اور بولے۔ ''بیٹھو...... اس وقت ہمارا اسٹاک فل ہے۔ ہمیں کسی Item کی ضرورت نہیں۔ یوں بھی اب آپ کے یہاں شنکر انڈسٹریز کے نام سے ایک صاحب نے نئی فرم کھولی ہے۔ وہ یہاں آئے تھے۔ اُن کا پروڈکٹ بھی آپ کے جیسا ہی ہے۔ لہٰذا میں نے ان کو بلک آرڈر دے دیا ہے۔ یوں بھی ہم نئے آنے والوں کو Cooprate کرتے ہیں، یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے۔ احمد آباد میں آپ کا پروڈکٹ بکنے کے Chances بہت کم ہیں۔ اچھا تو یہ ہے کہ اب آپ کوئی دوسرا مارکیٹ تلاش کر لیں، جیسے کشمیر وغیرہ۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں شمبھو بھائی؟ میرے اور آپ کے بہت پُرانے Relations ہیں اور میرا پروڈکٹ بھی نیا نہیں بہت پُرانا ہے۔ آپ کو ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔''

''ایسا ہے ولی بھائی، مارکیٹ میں پروڈکٹ تو وہ بکے گا جسے ہم بیچیں گے...... کیا نیا اور کیا پُرانا......! چائے پانی کچھ پئیں گے آپ؟''

''جی نہیں، شکریہ۔''

''ٹھیک ہے، پھر آیئے گا...... ویسے میری رائے ہے کہ فی الحال آپ گجرات میں کاروبار کرنے کا ارادہ چھوڑ دیں تو اچھا ہے۔''

یہ کہہ کر شمبھو بھائی ٹیبل پر رکھے ہوئے کاغذات دیکھنے لگے۔ ان کے رویئے سے مجھے سخت

مایوسی اور افسوس ہوا۔ میرے پیر من من بھر کے ہو گئے، ندامت اور شرمندگی کا بوجھ اپنے کندھوں پر اُٹھائے میں ان کی دکان سے باہر آیا تو سورج کی تیز شعاعیں میرے وجود میں گھستی چلی گئیں اور یہ تمازت مجھے قدرے اچھی لگی۔ میں نڈھال نڈھال سا کچھ دیر یوں ہی تیز دھوپ میں چلتا رہا......

انسان اپنے مفادات اور منافع کے لئے بے حد کمینہ ہوتا ہے۔ میں شمبھو بھائی کے یہاں ذلیل ہونے کے بعد بھی بے ارادہ چلتا ہوا گجرات کوآپریٹیو اسٹور کی شاندار عمارت تک پہنچ گیا۔ دل ہی دل میں دعائیں مانگتا رہا کہ جو تذلیل پٹیل اینڈ سنس کے یہاں ہوئی، وہ گجرات کوآپریٹیو اسٹور میں نہ ہو۔ عمارت میں داخل ہو کر میں سیدھا منیجر جینتی بھائی کے کمرے میں پہنچا۔ لیکن وہاں منیجر کی کرسی پر جینتی بھائی کی جگہ کوئی سریش بی پٹیل بیٹھا تھا۔ مجھے سامنے کھڑا دیکھ کر اس نے ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''سو کام پچھے؟''

''جینتی بھائی سے ملنا تھا۔'' میں نے کہا۔

''جینتی بھائی تو ریٹائر ہو گیا۔ کوئی اور کام ہو تو بولو۔''

میں نے اپنی کمپنی کا وزیٹنگ کارڈ، جس پر میرا نام پرنٹ نہیں تھا، جیب سے نکالا اور سریش بی پٹیل کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے کارڈ پڑھا اور بولا۔

''بیٹھو۔''

میں اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے میری کمپنی کے وزیٹنگ کارڈ کو غور سے پڑھا۔ میرے اوپر ایک بھرپور نظر ڈالی اور کہنے لگا۔

''آپ کی کمپنی کا پروڈکٹ تو ابھی ہمارے اسٹاک میں ہے...... چائے پانی کچھ پئیں گے آپ؟''

''جی نہیں، دھنیہ واد!''

اس نے ایک بار پھر مجھے غور سے دیکھا اور بولا۔

''آپ کا نام کیا ہے؟''

میں اس کے اس سوال پر گھبرا گیا۔ شاید میں اس کے لئے تیار نہ تھا اور حونقوں کی طرح منیجر کے دفتر کو غور سے دیکھنے لگا۔ میں شاید اس کے اس سوال کو کہ ''میرا نام کیا ہے؟'' ٹالنا چاہتا تھا...... یا اگر نام بتانا ہی پڑے تو کیا بتاؤں؟ سچ یا جھوٹ؟ میں اسی کشمکش میں تھا کہ منیجر نے ایک بار پھر ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''میں نے پوچھا مسٹر...... آپ کا نام کیا ہے؟''

''جی...... جی...... میرا نام...... اے۔ پی۔ سنگھ ہے۔''

''اچھا...... ویری گڈ...... آپ کے پتا جی کا نام کیا ہے؟''

''این۔ پی۔ سنگھ۔'' میں نے کہا۔

''''اچھا مسٹر سنگھ، یہ بتایئے کہ آپ کا گوتر کیا ہے؟''

''راٹھور۔'' میں نے کہا۔

''اچھا، تو آپ راٹھور ہیں۔ آپ سے مل کر اچھا لگا۔'' یہ کہہ کر اس نے گرمجوشی سے مصافحہ کے لئے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور نوکر کو آواز دی۔

''اے بابو بھائی...... باہر گاؤں سے ویاپاری آیو چھے...... تمیں خبر نہ تھی...... بے گلاس پانی آپو نے بے باشاہی۔'' ملازم کو ہدایت دے کر سریش بی پٹیل نے محبت بھری نظروں سے مجھے دیکھا اور کہنے لگا۔

''راٹھور صاحب، آپ کا پروڈکٹ تو ہمارے اسٹاک میں ہے، لیکن کوئی بات نہیں۔ آپ اتنی دور سے آئے ہیں تو آپ کا مان تو رکھنا ہی پڑے گا۔ ویسے بھی پٹیل اور راٹھور ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔ آپ آرڈر فارم نکالئے اور ہمارا آرڈر لکھئے، اور جتنا آپ کا دل چاہے اتنا لکھیے، اور جلد سے جلد بھیجئے۔ اگر کوئی تکلیف ہو، یعنی مال سپلائی کرنے میں آپ کو کوئی Difficulty ہو تو بتایئے۔''

''نہیں پٹیل صاحب، کوئی Difficulty نہیں ہے، اور ویسے بھی جب آپ کا Best Coopration ہمارے ساتھ ہے تو پھر کوئی مشکل ہو ہی نہیں سکتی۔''

''ٹھیک ہے راٹھور صاحب، مال آپ جلدی بھیجیں۔''

میں نے اپنی چائے ختم کی، حسبِ دل خواہ گجرات کوآپریٹیو اسٹور کا آرڈر لکھا، آرڈر فارم پر سریش بی۔ پٹیل کے دستخط کرائے، شکریہ ادا کیا اور اسٹور کی عمارت سے باہر نکل آیا۔ باہر آتے ہی ایک بار پھر سورج کی تیز شعاعیں میرے وجود میں گھستی چلی گئیں اور میں اپنے آپ کو مجرم سا محسوس کرتا ہوا تیز دھوپ میں چلتا رہا اور سوچتا رہا کہ کیا جھوٹ بول کر کاروبار کرنا مناسب ہے؟ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ آخر میں نے اپنی پہچان کیوں چھپائی؟ اسی طرح کے خیالات میں غلطاں و پیچاں میں کافی دور تک پیدل چلتا رہا...... دھوپ کی تمازت سے میرا سر چکرانے لگا اور جوتوں کے اندر پیروں میں سے آگ نکلنے لگی۔ تب میں نے آٹو رکشا روکا، اس میں بیٹھا اور اپنے ہوٹل کی طرف چل دیا۔ ہوٹل پہنچ کر میں کچھ دیر تک اپنے کمرے کو خالی خالی

نظروں سے پنجرے میں قید پرندے کی طرح دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ میں احمد آباد آیا ہی کیوں؟ مجھے احمد آباد آنا ہی نہیں چاہیئے تھا۔ اِن ہی خیالات کے درمیان مجھے دھن سکھ سیٹھ کی یاد آئی۔ دھن سکھ سیٹھ سورت میں ''کویتا لوج'' کے نام سے ایک چھوٹا سا لوج اور ریسٹورینٹ چلاتے تھے۔ میری جوانی کے دو اہم سال ان کے Lodge میں ان کے ساتھ گزرے تھے۔ میں ان دنوں مراد آباد کے پیتل کے برتنوں کا کاروبار کیا کرتا تھا۔ لہٰذا میں نے سوچا کہ فی الحال گجرات میں کاروبار کرنے کا ارادہ چھوڑ دیا جائے اور دھن سکھ سیٹھ کے پاس چلا جائے، ماضی کی یادوں کو تازہ کیا جائے اور دو چار دن ان کے ساتھ گزار کر گھر کو واپس ہو لیا جائے۔ یہ سوچ کر کہ دھن سکھ سیٹھ سے ملاقات ہوگی، مجھے خوشی ہوئی اور خیال آیا کہ سارے دن سے کچھ کھایا ہی نہیں۔ زوردار بھوک لگ رہی تھی۔ چونکہ بھوک سب طرح کے خیالات پر حاوی ہو جاتی ہے، لہٰذا میں دن بھر کی کدورت بھول کر کالو پور ٹاور کے پاس بھننے والے مٹن، چکن اور فش فرائی کے بارے میں سوچنے لگا۔ یوں بھی گجرات کو آپریٹیو اسٹور سے شاندار آرڈر ملا تھا...... منافع تو بہر حال منافع ہی ہوتا ہے، چاہے اس میں کتنی ہی اخلاقی گراوٹ کیوں نہ ہو۔ لہٰذا میں نا چاہتے ہوئے بھی اپنے اندرون کے کسی نہ کسی کونے میں خوش ضرور تھا...... اور اگر انسان اندرون کے کسی نامعلوم کونے میں بھی خوش ہے تو اس کا کچھ نہ کچھ عیاشی کرنے کو دل ضرور چاہتا ہے۔ خواہ وہ لذیذ کھانوں کی لمحاتی عیاشی ہی کیوں نہ ہو۔ لہٰذا میں ایک ادائے خاص سے کالو پور ٹاور پہنچ گیا۔

کڑھائی مٹن، کباب، چکن کی مختلف ڈشیں فش فرائی سب کچھ تھا۔ فضا میں گوشت بھننے کی بڑی دلفریب خوشبو تھی۔ لیکن ماحول اور لوگوں کے رویے تکلیف دہ تھے۔ شلوار قمیض، بے ڈھنگی داڑھیاں، گول ٹوپیاں، بہت اکھڑ لوگ۔ ایک دوسرے سے فحش مذاق کرتے ہوئے۔ گھر، سڑک اور ہوٹل کے فرق کا شعور ہی نہیں۔ میں اس پورے ماحول کو کچھ دیر کھڑے ہو کر غور سے دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن کوئی ادھر سے دھکا دے کر گزر جاتا، کوئی اُدھر سے۔ پھر بھی بھوک پورے شباب پر تھی، اور کباب، قورے کا اپنا ایک نشہ ہوتا ہے۔ لہٰذا میں ایک بھٹیار خانے میں داخل ہو گیا۔ کرخت شکل وصورت کا ایک شخص بھٹیار خانے کے کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھا تھا۔ اس کے آگے چھوٹی سی کوئلوں کی انگیٹھی دہک رہی تھی۔ انگیٹھی پر ایک بڑا طباق رکھا ہوا تھا جس میں مصالحہ والی مچھلی کے قتلے پھیلے ہوئے تھے۔ قتلوں کو دیکھ کر میرا دل خوش ہو گیا...... چونکہ مسلم ہوٹلوں میں اکثر روٹیاں ٹھنڈی ہوتی ہیں۔ اس لئے میں نے بس یوں ہی اس شخص سے پوچھ لیا، جو کہ مجھے طبعاً اکھڑ معلوم ہوتا تھا۔

''روٹیاں تو گرم ہوں گی آپ کے یہاں...... میرا مطلب ہے تندور تو جل رہا ہوگا؟''
میری بات سن کر اس شخص نے مجھے گھورا، سر پر سے ٹوپی اتاری اور سر کو زور سے کھجاتا ہوا کاؤنٹر کے پیچھے سے اٹھ کر میرے سامنے آکر کھڑا ہو گیا اور اپنی دونوں موٹی موٹی آنکھیں، جو کہ جنگلی کبوتر کی آنکھوں کی طرح تھیں، میرے چہرے پر گڑاتے ہوئے بولا۔
''روٹی تو روٹی ہوتی ہے...... کیا گرم اور کیا ٹھنڈی۔ تمہیں اتنا بھی نہیں معلوم کہ روٹی اللہ کی نعمت ہے۔ اسے کھا کر خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے۔ گرم اور ٹھنڈی کے چکر میں نہیں رہنا چاہئے...... سمجھے۔ تم مجھے کچھ پڑھے لکھے آدمی معلوم ہوتے ہو۔ تمہارے جیسے پڑھے لکھوں ہی نے مسلم مذہب کو غارت کیا ہے۔ روٹی چاہئے...... وہ بھی گرم...... یہاں جیسی بھی روٹی ہے، کھانی ہے تو کھاؤ ورنہ چلتے پھرتے نظر آؤ۔''
میں اس کی گھڑکی سے دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ میں اس سے کہنا چاہتا تھا کہ پیسے لے کر کھانا کھلاتے ہو یا خیرات بانٹ رہے ہو؟...... لیکن کہہ نا سکا۔ چپ چاپ کالو پور ٹاور سے ریلیف روڈ واپس آیا۔ ایک چھوٹے سے ریسٹورینٹ میں اڈلی سانبھر کو زہر مار کیا اور ہوٹل گرین پیلیس واپس آگیا۔ کاؤنٹر پر اکبر بھائی کھڑا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔
''صبح ۴ر بجے اٹھادیں۔ مجھے یہاں سے جانا ہے۔ بل وغیرہ ابھی بھیج دیں اور اگر ممکن ہو تو صبح ۴ر بجے ایک کپ چائے میرے کمرے میں بھجوا دیں۔''
اکبر نے میری شکل دیکھی اور مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔
''فکر مت کیجئے جناب۔ آپ کو صبح چار بجے چائے بھی ملے گی اور نوکر آپ کو اٹھا بھی دے گا۔''

مجھے اس کا رویہ اچھا لگا۔ میں نے اسے شب بخیر کہا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔
صبح ٹھیک چار بجے میرے کمرے کی گھنٹی بجی۔ میں نے دروازہ کھولا تو بیرا ہاتھ میں چائے کی کیتلی اور کپ لئے کھڑا تھا۔ میں نے منہ پر پانی کے چھپاکے مارے اور صبح کی چائے کا ذائقہ لینے لگا۔ مساجد سے فجر کی اذان شروع ہو چکی تھی اور مندروں سے گھنٹے بجنے اور بھجنوں کی آوازیں آرہی تھیں، جو کہ رات کے خاتمے اور دن کی آمد کا اعلان کر رہی تھیں۔ لہٰذا میں نے سوچا کہ فی الحال تو یہاں سب کچھ ٹھیک ہے۔ میں بے وجہ ہی رات گھبراتا رہا اور خوفناک خواب دیکھتا رہا۔ رات بھر سوتا جاگتا رہا۔ شہر میں تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے۔ یہ خیال آتے ہی میں نے اپنی چائے ختم کی، کمرے کا دروازہ بند کیا، ٹانگیں پھیلائیں اور لمبی تان کر سو گیا۔
دوبارہ جب آنکھ کھلی تو دن کے ساڑھے دس بج چکے تھے۔ میں جلدی سے اٹھا، باتھ روم گیا،

نہایا، اپنا سامان سمیٹا، سوٹ کیس اٹھایا اور ہوٹل گرین پیلیس سے باہر آ گیا...... آٹو رکشا پکڑا اور بس اسٹینڈ کی طرف چل دیا۔ بس اسٹینڈ پر تھوڑی دیر انتظار کرنے کے بعد سورت جانے کے لئے اتفاقاً ایک لگژری بس مل گئی۔ میں نے بس میں اپنا سامان رکھا، ٹکٹ خریدا اور ونڈو سائڈ کی ایک سیٹ پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر کے بعد بس چل پڑی اور جلدی ہی احمد آباد کی بھیڑ بھاڑ سے نکل کر نیشنل ہائی وے پر دوڑنے لگی۔

کھیڑا ضلع شروع ہو چکا تھا۔ تمباکو اور کیلے کے کھیتوں کا دور دور تک پھیلا ہوا سلسلہ تھا جو کہ بے حد دلکش لگ رہا تھا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے سرسرا رہے تھے اور کانوں میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ چونکہ بس کی اسپیڈ خاصی تیز تھی، اس لئے سڑک کے دونوں طرف کے مناظر بھی تیزی سے بدل رہے تھے۔ ایسے میں مجھے ''کویتا لوج'' کے مالک دھن سکھ سیٹھ کی شدت سے یاد آ رہی تھی۔

دھن سکھ سیٹھ ایک شریف اور شاندار انسان تھا۔ ہندوستانیت اس میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ وہ کویتا لوج میں ٹھہرنے والے مسافروں کو مسافر نہیں، اپنا مہمان سمجھتا تھا اور مہمانوں کی طرح ہی ان کی خاطر اور دیکھ بھال کرتا تھا۔

کویتا لوج کے کچھ مستقل گراہک تھے یعنی وہاں پر بہت دنوں سے رہ رہے تھے۔ جن میں ظہیر خان، کرشنا شنکر اور روی وغیرہ تھے۔ یہ سب دھن سکھ کے خاص مہمان بھی تھے اور دوست بھی۔ شام ہوتے ہی ظہیر خانؔ کے کمرے میں شراب کی بوتل، سوڈے، گلاس، ٹھنڈا پانی، سلاد اور اناس کے ٹکڑوں کے علاوہ مونگ پھلی کے موٹے موٹے دانے (جو کہ شرابیوں کے لئے خاص طور سے بھروچ سے منگوائے جاتے تھے) بڑے سلیقے سے سجا دئے جاتے۔ کرشنا کے کمرے میں چرس کی گولیاں، سگرٹ کے پیکٹ اور چرس کی گولیوں کو سلگانے کے لئے ماچس کی تیلیاں رکھ دی جاتیں۔ روی اور شنکر اول نمبر کے خانہ خراب تھے۔ دونوں افیم، بھانگ چرس اور شراب سب سے محظوظ ہوتے تھے لہٰذا ان کے کمرے میں بھی ضرورت کی تقریباً سب چیزیں پہنچا دی جاتیں۔ رات ہوتے ہی ان لوگوں کے کمروں میں دوست جمع ہو جاتے اور ہنگامہ شروع ہو جاتا۔ دھن سکھ سیٹھ فرداً فرداً سب کے کمروں میں جاتا اور معلوم کرتا۔ ''کیم صاحب! سب برو بر چھے نا؟''

''ارے دھن سکھ سیٹھ..... تم کمال کا مانس چھے۔ تارو جیسا بیجو کوئی مانس نہ تھی۔ اکھے گجرات ما تارو جواب نہ تھی۔''

ہر کمرے سے دھن سکھ سیٹھ کو ایسے ہی تعریفی کلمات سننے کو ملتے۔ اس کی باچھیں کھل

جاتیں، وہ اپنی گول گول آنکھیں گھماتا، خوش ہوتا اور اپنے خاص ملازم عبدل سے کہتا۔

''صاحب نو خیال راکھ جو...... کیم؟''

گاندھی جی کی جنم بھومی ہونے کی وجہ سے گجرات ڈرائی ایریا ہے۔ یہاں شراب پینا قانوناً جرم ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ اسی صوبے میں سب سے زیادہ انسانی خون پیا گیا اور بہایا گیا ہے۔ اگر دھن سکھ سیٹھ کے زاویۂ نظر سے دیکھا جائے تو گجرات سے شراب بندی ختم ہونی چاہئے کیوں کہ شراب پینا ایک سیکولر عمل ہے۔ بقول دھن سکھ سیٹھ کے، کہ سرکار اگر ہندو مسلم منافرت کو ختم کرنا چاہتی ہے تو گجرات کو Wet Area بنا دینا چاہئے۔ یہی وجہ تھی کہ اگر رات کے بارہ بجے بھی دھن سکھ کے کسی گراہک کو شراب کی یا چرس کی ضرورت پڑتی تو وہ چہک کر جواب دیتا۔

''کائی واندھا نہ تھی صاحب، کائی واندھا نہ تھی۔'' یہ کہہ کر وہ عبدل کو آواز دیتا، اس کے کان میں کچھ کہتا، تھوڑی دیر میں عبدل شراب یا چرس لے کر مسافر کے کمرے میں پہنچ جاتا۔

ظہیر خان تو خاص طور سے رات کے گیارہ یا بارہ بجے کے آس پاس اپنی لنگی لپیٹتا ہوا جو کبھی آدھی کھل جاتی، کبھی پوری، اپنے کمرے سے باہر آتا اور عبدل کو زور زور سے آوازیں دینے لگتا...... اور عبدل کو دیکھتے ہی شور مچاتا۔

''اے عبدل...... باٹلی کھلاس تھئی گئی...... تما کھبر نہ تھی...... بیجی آپو......''

عبدل بڑے ادب سے جواب دیتا۔ ''سیٹھ آپ کمرے میں بیٹھو۔ میں لاتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ ظہیر خان کا بازو پکڑ کر کمرے میں لے جاتا اور ظہیر خان کو اندر کر کے باہر سے دروازہ بند کر دیتا اور فٹافٹ دوسری بوتل لاتا...... ابھی وہ ظہیر خان کے کمرے میں بوتل اور پانی رکھ ہی رہا ہوتا تھا کہ کرشنا کے کمرے سے زوردار آوازیں آنے لگتیں اور عبدل بجلی کی سی تیزی سے کرشنا کے کمرے میں ہوتا۔

رات کے ساڑھے بارہ بجے کے آس پاس کویتا لوج کا ڈراپ سین کچھ اس طرح ہوتا کہ جب سب کمروں سے ہنگامے بند ہو جاتے اور آوازیں آنی بند ہو جاتیں، تب لوج کے اندر داخل ہونے والا لکڑی کا زینہ لرزنے لگتا اور دھڑ دھڑ کی آوازیں آنے لگتیں۔ پتہ چلتا کہ پولیس آفیسر ڈیسائی نشے میں دھت اپنے بھاری بھرکم ڈیل کو ڈھوتا ہوا اور بغل میں کسی بھکارن نما عورت کو دبائے ہوئے لوج میں داخل ہو رہا ہے۔ عبدل اور دھن سکھ سیٹھ دوڑے دوڑے زینے کی طرف جاتے اور ڈیسائی کو زینہ چڑھنے میں مدد کرنے لگتے۔ ایک منزل چڑھنے کے بعد جب ڈیسائی اور اس کی بغل میں دبی عورت کو دوسری منزل کے لئے (جو کہ آدھی سے زیادہ

خالی تھی، صرف تین کمرے وہاں تھے، ایک میں ڈیسائی رات بسر کیا کرتا تھا اور دو کویتا لوج کے اسٹور تھے۔) لے جایا جاتا تو وہ عورت زور زور سے رونا شروع کر دیتی۔ اس پر ڈیسائی گینڈے کی طرح پلٹتا اور عورت کو مارنے کے لئے ہاتھ گھماتا۔ لیکن وہ عورت نیچے کو جھک جاتی اور ڈیسائی کا وار خالی چلا جاتا۔ جب تک ڈیسائی کچھ سنبھل کر دوسرا وار کرنے کی پوزیشن میں آتا، تب تک عبدل اور دھن سکھ اس عورت اور ڈیسائی کو کمرے میں دھکیل دیتے اور زینے کا دروازہ باہر سے بند کر دیتے۔ کچھ دیر تک ڈیسائی کے کمرے سے عورت کے چیخنے چلانے کی آوازیں آتیں، پھر اس کے بعد فضا ہموار ہو جاتی اور کویتا لوج میں سناٹا چھا جاتا۔

بس ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی اور میری سوچوں کا سلسلہ بھی ٹوٹ گیا۔ بس بڑودہ اور بھروچ کے درمیان ہائی وے پر بنے ڈھابے پر رکی تھی...... بس کے کنڈکٹر نے زور زور سے کہا...... ''بس چائے ناشتے کے لئے پندرہ منٹ رکے گی۔''

میں جب سورت پہنچا تو سورج ڈوب چکا تھا۔ آسمان پر شفق باقی تھی جو کہ آہستہ آہستہ سیاہی میں تبدیل ہو رہی تھی۔ میں نے اپنا سوٹ کیس اُٹھایا اور پیدل ہی کویتا لوج کی طرف چل دیا۔ یوں بھی Lodge بس اسٹینڈ اور ریلوے اسٹیشن سے زیادہ دور نہ تھا۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ برسوں کے بعد دھن سکھ سیٹھ سے ملنے کا تجسس بھی تھا اور تفکر بھی کہ اچانک مجھے سامنے دیکھ کر دھن سکھ کیا سوچے گا؟ کیا وہ مجھے پہچان پائے گا؟ اگر پہچان لیا تو اس کے تاثرات کیا ہوں گے اور اگر اتفاقاً اس نے نہیں پہچانا تو میری حالت کیا ہوگی......؟ انہیں خیالات میں غوطہ زن میں چلتا رہا اور کویتا لوج تک پہنچ گیا۔

شام ہو چکی تھی۔ بجلی کے بلب روشن ہو چکے تھے لیکن کویتا لوج میں روشنی نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں اپنا سوٹ کیس ہاتھ میں لئے Lodge میں داخل ہو گیا...... لکڑی کا وہی پُرانا زینہ تھا۔ پہلی سیڑھی پر قدم رکھتے ہی میں چونک گیا...... سیڑھی کے اوپر سیاہی مائل ایک بڑا سا دھبہ تھا۔ دھبے کے کنارے گہرے عنابی تھے۔ یہ سلسلہ پورے زینے پر تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے عنابی سیال زینے پر گر گیا ہو اور وقت کے دھارے نے اسے کالے دھبوں میں تبدیل کر دیا ہو۔ پہلی منزل پر پہنچ کر میں مزید حیران ہوا کہ لوج کے اندر روشنی غائب تھی، فقط ایک زیرو واٹ کا بلب جل رہا تھا...... Reception کی جگہ ایک شخص اسٹول پر بیٹھا تھا۔ اس کی بے ترتیب داڑھی اور مونچھیں تھیں، سر کے بال بھی لمبے تھے اور اس کے ماتھے پر لمبا تلک لگا تھا...... پہلی نظر میں وہ سادھو جیسا لگتا تھا۔ لیکن اس کا لباس سادھوؤں جیسا نہ تھا...... اس نے چونکتے ہوئے مجھے غور سے دیکھا...... میں نے اپنا سوٹ کیس زمین پر رکھتے ہوئے اس سے کہا۔

''مجھے رات گزارنے کے لئے ایک کمرہ چاہئے۔''

اس شخص نے مجھے حیرت سے دیکھتے ہوئے کچھ ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔''یہاں اب مسافرنہیں ٹھہرتے۔'' مجھے اس کی آواز جانی پہچانی سی لگی۔ میں نے اسے غور سے دیکھا تو اس کا چہرہ بھی جانا پہچانا سا لگا۔ میں نے اس سے کہا۔''یہ لوج ہے...... پھر یہاں مسافر کیوں نہیں ٹھہر سکتے عبدل؟''میرے عبدل کہہ کر مخاطب کرنے کے بعد بھی اس کے چہرے پر کسی طرح کے تاثرات پیدا نہ ہوئے۔ اس نے اسی ٹھہرے ہوئے سرد لہجے میں کہا۔

''یہ جگہ مسافروں کے لئے بند کر دی گئی ہے۔ یہاں اب کارسیوک آکر ٹھہرتے ہیں اور اپنی میٹنگیں کرتے ہیں۔''

''لاحول ولا قوۃ۔'' یہ تخریب کار بھی کیسے کیسے نام رکھتے ہیں۔ کہیں کارسیوک، کہیں مجاہدین...... عبدل، تم مجھے پہچان نہیں رہے ہو، میں مرادآباد کے برتن بیچنے والا ہوں۔ اس لوج کے کمرہ نمبر سات میں، میں کئی سال رہا ہوں۔ تم یاد کرو، جس دن میرا کام اچھا ہوتا تھا اور معقول رقم میری جیب میں آجاتی تھی، اس دن میں بلقیس کو بلایا کرتا تھا۔ تم ہم دونوں کو چکن بریانی کھلایا کرتے تھے۔ کبھی کبھی ہم دونوں کے ساتھ فلم دیکھنے بھی جایا کرتے تھے...... اچھا عبدل، یہ بتاؤ دھن سکھ سیٹھ کہاں ہیں؟''

''اُن کو قتل کر دیا گیا۔'' عبدل کی آواز گونجی...... میں نے حیرت سے کہا۔''کیا؟ دھن سکھ سیٹھ جیسے پُرخلوص اور نفیس انسان کو کس نے قتل کیا؟''

''معلوم نہیں صاحب۔ جب گودھرا اور احمد آباد میں فساد ہوئے تب یہاں بھی تناؤ بڑھ گیا۔ سیٹھ ہندو مسلم نفرت پھیلانے والوں کو کھلم کھلا گالیاں بکتا تھا۔ تناؤ جب زیادہ بڑھا اور جھگی جھونپڑی والے مسلمانوں کو اجاڑا گیا تو اپنا سیٹھ مسلمانوں کی حمایت میں کھل کر سامنے آگیا۔ بس پھر کیا تھا، پہلے تو اسے دھمکیاں دی گئیں، پھر ایک دن شام کو کچھ لوگ آئے اور جہاں آپ کھڑے ہیں، اسی جگہ پر دھن سکھ سیٹھ کو پکڑا اور قتل کر دیا...... اس کے بعد وہ لوگ ان کی لاش گھسیٹتے ہوئے زینے سے نیچے سڑک پر لے گئے اور سڑک کے بیچوں بیچ رکھ کر شور مچایا کہ دیکھو، مسلمانوں نے دھن سکھ سیٹھ جیسے سجن مانس کی ہتیا کر دی...... پھر کیا تھا صاحب...... دیکھتے ہی دیکھتے پورا شہر بھاری بوٹوں کی زد میں آگیا۔ کچھ علاقوں میں تو بھیانک کالی آندھی چلی اور انسانی خون پانی کی طرح نالیوں اور سڑکوں پر بہا دیا گیا۔''

''اوہ...... عبدل، میں بہت دور سے دھن سکھ سیٹھ سے ملنے آیا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہاں قیامت گزر گئی...... میں یہاں بہت دنوں تک سات نمبر کے کمرے میں رہا ہوں۔ اس

کے سامنے والے میں ظہیر خان رہا کرتے تھے اور ان کے برابر والے میں کرشنا وغیرہ رہتے تھے۔ ذرا کمرے تو کھول کر دکھاؤ۔''

یہ سنتے ہی وہ اپنی جگہ سے اُٹھا، کمروں کی چابیاں اٹھائیں اور Lodge کی گیلری میں داخل ہو گیا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ سب سے پہلے اس نے کرشنا والا کمرہ کھولا...... اس کمرے میں ترشول، تلواریں، لاٹھیاں اور اسی قسم کے ہتھیار تھے۔ میں نے پوچھا...... ''یہ کیا ہے؟'' اس نے جواب دیا...... ''یہ کارسیوکوں کے کارسیوا کرنے کے اوزار ہیں۔''

اس کے بعد اس نے ظہیر خان والا کمرہ کھولا...... اس کے اندر مسلم عورتوں کے برقعے، شلواریں اور قمیصیں ٹنگی تھیں۔ میں نے اس سے پوچھا...... ''یہ کیا ہیں؟''

اس نے جواب دیا۔ ''یہ کارسیوکوں کی ویرگاتھا اور شوریہ گاتھا کی نشانیاں ہیں۔'' اس کے بعد اس نے میرا والا کمرہ کھولا۔ وہ کمرہ کتابوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہاں کچھ پتلی، اور کچھ موٹی موٹی کتابوں کا ڈھیر تھا۔ ان کتابوں پر ہیڈگیوار، گروگولوالکر، شیاما پرساد مکھرجی، دیورس، وی۔ ڈی۔ ساورکر، ایڈوانی اور نریندر مودی وغیرہ کی تصویریں بنی ہوئی تھیں...... میں نے پوچھا۔ ''یہ کیا ہے؟'' اس نے جواب دیا۔ ''یہ کارسیوکوں کا ساہتیہ ہے۔ نوجوانوں کو یہ ساہتیہ پڑھنے کے لئے دیا جاتا ہے اور کارسیوکوں میں شامل ہونے کی صلاح دی جاتی ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے کمرے بند کرنے شروع کر دئے۔ میں نے اس سے پوچھا۔

''اوپر والے مالے کا کیا حال ہے، جہاں ڈیسائی نشے میں دھت ہو کر عورتوں کو لایا کرتا تھا اور وہ عورتیں رات کو چیخا کرتی تھیں اور شور مچایا کرتی تھیں؟''

اس پر اس نے جواب دیا۔

''اوپر والا مالا مکمل طور پر بند کر دیا گیا ہے۔ وہاں سے اب بھی رات کو رونے اور چیخنے کی آوازیں آتی ہیں۔''

ہم دونوں باتیں کرتے ہوئے اسی جگہ واپس آ گئے، جہاں عبدل اسٹول ڈال کر بیٹھا تھا۔ چلتے ہوئے اس نے کسی کمرے میں سے میرے لئے بھی ایک اسٹول اٹھا لیا۔ لہٰذا ہم دونوں پاس پاس بیٹھ گئے۔

میں نے اس سے معلوم کیا۔

''یہ عمارت، جس کے نیچے دکانیں اور اوپر کویتا لوج واقع ہے، کیا دھن سکھ سیٹھ کی ملکیت نہ تھی کہ اب یہاں کارسیوک آدھمکے ہیں؟''

''یہ کسی سنستھا کی جگہ ہے......'' عبدل نے کہا۔ ''دھن سکھ سیٹھ تو کرائے دار تھے۔ اب اس سنستھا نے یہ اوپر کے دو مالے، جن میں کہ کویتا لوج تھا، کارسیوکوں کو دان کر دئے ہیں۔''
میں نے اس سے پوچھا۔
'اچھا، عبدل یہ بتاؤ، تم نے اس طرح کا حلیہ کیوں اختیار کیا ہے؟ یہ سادھوؤں جیسی داڑھی مونچھیں، ماتھے پر تلک......''
اس نے خلاء میں گھورتے ہوئے کہا۔ ''آپ کے پاس سگریٹ تو ہوگا! ایک سگریٹ پلائیے۔''
میں نے سگریٹ کا پیکٹ اپنی جیب سے نکالا۔ ایک سگریٹ عبدل کو دیا اور ایک اپنے منہ میں لگا لیا۔ عبدل نے سگریٹ کا لمبا کش لگایا اور سارا دھواں خلاء میں چھوڑ دیا۔ میں چند لمحوں تک اپنے سوال کے جواب کا انتظار کرتا رہا۔ لیکن عبدل تو جامد و ساکت تھا۔ میں نے بھی سگریٹ کا ایک لمبا کش لیا اور اس سے بولا۔
''عبدل، یہ بتاؤ بلقیس کہاں ہے؟ اس سے ملنے کو میرا دل بیقرار ہے!''
یہ سنتے ہی عبدل کے جسم میں جھرجھری پیدا ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں دبا ہوا سگریٹ چھوٹ گیا اور اس نے اپنی نظریں جھکا لیں۔ میں نے دھندلکے میں بھی محسوس کیا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو ہیں جو کہ اس کی گھنی داڑھی میں جذب ہو رہے ہیں۔ خوف کی پرچھائیاں اس کے وجود میں لرزاں تھیں۔ چند لمحوں کے بعد اس کے ہونٹ کانپے اور مغموم سی بھرّائی ہوئی آواز میں وہ گویا ہوا۔
''اب آپ جاؤ صاحب...... اندھیرا ہو گیا ہے اور کارسیوکوں کے آنے کا سمے ہو گیا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ اسٹول پر سے اُٹھا، زمین پر سلگتے ہوئے سگریٹ کو اس نے اپنے پیروں سے مسلا، اپنے دونوں ہاتھوں کو پیٹھ کے پیچھے باندھا، اور Lodge کی گیلری میں داخل ہوا اور چلتا چلا گیا۔
OO

یٰسین احمد

افسانہ

سَن آف اے بِچ

قیدی وثوق سے نہیں بتا سکتا تھا کہ دشمن کی تعداد پانچ تھی یا چھ۔ یعنی تین مرد، ایک عورت اور ایک کتا۔ یا پھر چار مرد، ایک عورت اور ایک کتا۔ قیدی کو اپنے ان ساتھیوں کی تعداد کا بھی اندازہ نہیں تھا جو اسی کی طرح قیدی بنا کر وہاں لائے گئے تھے۔ اس دن جب گن دکھا دکھا کر ان کو بارکوں کی طرف دھکیلا جا رہا تھا، تب اس نے دیکھا تھا کہ اس کے اپنے ساتھیوں کی تعداد سینکڑوں میں ہے۔ آہستہ آہستہ ان کی تعداد گھٹتی گئی تھی۔ ان کو رہا کر دیا گیا تھا یا پھر ان کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا......؟ قیدی یہ نہیں جانتا تھا۔

اس وقت تو وہ سب کے سب بے حال ہو رہے تھے۔ انتہائی تھکے ماندے، بھوک پیاس کی شدت سے نڈھال اور زخموں سے چور، دھول مٹی اور سیاہی میں چہرے اور لباس اَٹے ہوئے۔ قیدی نے ان کو پہچاننے کی بہت کوشش کی تھی، لیکن کسی چہرے کو شناخت نہ کر سکا۔ ہر چہرہ اپنی پہچان کھو چکا تھا۔ جو ہٹے کٹے تھے، صحت مند تھے، چلنے پھرنے کے قابل تھے، ان کو چن چن کر الگ کیا گیا تھا تاکہ از سرِ نو اذیتوں کا سلسلہ شروع کر سکیں۔

قید و بند کی صعوبتیں اس کے لئے نئی نہیں تھیں۔ اس عذاب کی آگ میں اس وقت بھی جھلس چکا تھا جب ایک پڑوسی ملک کے فوجیوں نے اسے قیدی بنایا تھا۔ ان کی قید میں وہ ایک طویل عرصہ تک رہا۔ لیکن اتنی حیوانیت، اتنی درندگی کا مظاہرہ نہیں کیا گیا تھا۔ یہاں تو آتے ہی اس پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔

گھونسوں، لاتوں اور گن کے دستوں سے اس کا استقبال کیا گیا۔ لگاتار وہ قیدی کو پیٹتے رہے اور اس پر سوالات کی بوچھار شروع کر دی۔ لیکن قیدی نے زبان نہیں کھولی۔ کراہا نہ چیخا، چپ چاپ ان کی اذیتیں سہتا رہا۔ جیسے وہ اس پر پھول برسا رہے ہوں۔ قیدی کا یہ رویہ ان کو مزید اشتعال دلا رہا تھا۔ ان کے ہاتھ پاؤں اور تیزی سے چلنے لگے۔ ایک تھک کر ہانپنے لگتا تو دوسرا اس کی جگہ لے لیتا...... دوسرے کے بعد تیسرا۔ قیدی کو چین سے بیٹھنے کا موقع نہیں دیا

گیا۔ یہ سلسلہ گھنٹوں چلتا رہا لیکن قیدی کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا۔ انتہائی سخت جان تھا وہ...... لہولہان ہو چکا تھا، جبڑے پھٹ چکے تھے، منہ سے خون رسنے لگا تھا، جسم کا جوڑ جوڑ سوج گیا تھا اور درد کی شدت سے ہڈیاں چٹخنے لگی تھیں۔ وہ ایسے سوالات کر رہے تھے جن کے جوابات کا اس کے فرشتوں کو بھی علم نہیں تھا۔ اگر علم ہوتا بھی تو ہرگز اُن کو کچھ نہ بتاتا۔

''سن آف اے بچ۔'' اس نے ایک نسوانی آواز سنی۔ ''میں اس کو سیدھا کر دوں گی۔''

کرخت اور کھردری آوازوں کے بیچ ایک نسوانی آواز قیدی کے لئے حیرت انگیز تھی۔ اس نے آواز کی سمت اپنے دیدے گھمائے۔ وہ وردی میں تھی۔ عورتوں جیسی کوئی بات اس میں نہیں تھی۔ کٹے ہوئے بال تھے اور ہونٹوں کے درمیان جلتا ہوا سگریٹ پھنسا ہوا تھا۔ اگر چھاتیوں کے ابھار نمایاں نہ ہوتے تو شناخت مشکل ہی تھی۔ ہاتھ میں ایک خونخوار کتے کی زنجیر پکڑ رکھی تھی۔

کتے کی زنجیر اپنے ایک ساتھی کے ہاتھ میں تھما کر وہ آگے بڑھی۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی جابرانہ مسکراہٹ ناچ رہی تھی۔ قیدی کے لہولہان جسم میں ایک یخ بستہ لہر دوڑ گئی۔ احساس کے پردے پر ایک بجلی سی لپکی کہ اب ایک نئی اذیت کا دور شروع ہونے والا ہے۔ عورت نے پہلے اس کے گرد طواف کیا۔ پہلا چکر ختم کیا اور دوسرے چکر میں جیسے ہی اس کی پشت کی طرف پہنچی، وہ بندر کی طرح فضا میں اُچھلی اور ایک فلائنگ کک نہایت بے رحمی سے قیدی کے جسم پر جڑ دیا۔ قیدی منہ کے بل زمین پر آ گیا۔ اس کے بعد عورت کے ساتھی اس پر ٹوٹ پڑے تھے۔ دو ساتھیوں نے قیدی کے ہاتھ پاؤں کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور دوسرے دو ساتھی اُس کے ہاتھ پاؤں کو رسی سے باندھنے لگے۔ وہ بے آب مچھلی کی طرح تڑپنے لگا تو عورت نے اپنا ایک گھٹنا ریڑھ کی ہڈی میں پیوست کر دیا۔ اب کتا بھی غرانے لگا تھا۔ کسی نے پشت کی طرف سے ایک تیز دھار چاقو کی مدد سے اس کے کپڑوں کو پنڈلی سے لے کر گردن تک چیر کر رکھ دیا تھا۔

جب قیدی کے دونوں ہاتھ پاؤں باندھ کر کھڑا کیا گیا، تب کپڑے از خود اس کے جسم سے الگ ہو کر نیچے گر پڑے۔ اب قیدی کے جسم پر زیر جامہ کے سوا اور کوئی لباس نہ تھا۔ اس کے لئے یہ لمحے بڑے اذیت ناک تھے۔ وہ ان کی ہر اذیت برداشت کرتا آرہا تھا۔ لیکن یہ تذلیل ......اس کی روح تک لرز اٹھی تھی۔ وہ تو اپنے باتھ روم، اپنی خواب گاہ میں بھی برہنہ ہونے کا عادی نہ تھا۔ اس کی غیرت تار تار ہونے لگی۔

معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہوا۔

عورت نے جلتا ہوا سگریٹ پھینک دیا اور دوسرا سگریٹ سلگایا۔ دو تین لمبے لمبے کش کھینچ کر اس نے سگریٹ کے جلتے ہوئے سرے کو تیز کیا اور مسکراتی ہوئی قیدی کے قریب آ گئی۔

عورت کے ساتھی کرسیاں گھسیٹ کر بیٹھ چکے تھے۔ وہ نہایت انہماک سے منظر دیکھ رہے تھے۔
عورت نے قیدی کے زیر جامے کو ایک جھٹکے سے نیچے کی طرف سرکایا اور پھر جلتا ہوا سگریٹ زیرناف کے حصہ پر رکھ دیا۔
قیدی تڑپ کر رہ گیا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ بے اختیار حلق کی گہرائیوں سے ابلنے والی چیخ کو بمشکل اس نے روکا تھا۔ پہلے اس کے بال جلے تھے اور پھر جلد۔ قیدی نے اپنی زندگی میں کبھی انسانی گوشت کو جلتا ہوا نہیں دیکھا تھا...... جلتے ہوئے گوشت کی بو نہیں سونگھی تھی...... آج اس کی اپنی جلتی ہوئی جلد کی بو نتھنوں میں پھڑپھڑا رہی تھی۔
عورت کی اس حرکت پر اس کے ساتھی لطف اندوز ہو رہے تھے۔ کتا بھی حیرت سے آنکھیں پھاڑتا ہوا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔
''کیسا لگ رہا ہے ہنی؟''
عورت کی آواز اس کے کانوں میں گونجی۔ قیدی نے نہ اپنی آنکھیں کھولیں اور نہ لب...... درد کے شعلے تیز تر ہوتے جا رہے تھے۔ چُر کے دینے کا عمل اس وقت ختم ہوا جب سگریٹ اپنا وجود کھو بیٹھا اور پھر عورت نے کتے کو للکارا۔ کتا تو جیسے عورت کے اشارہ کا منتظر تھا۔ وہ قیدی پر جھپٹ پڑا۔ قیدی لہرا کر زمین پر آ گیا۔ اس نے اپنے دونوں پاؤں سکیڑ کر پیٹ میں دبا لئے تھے اور کتا اس کے زخموں سے رستے ہوئے خون کو چاٹنے لگا۔
اُن کے لئے یہ منظر بہت دلکش تھا۔ خوش ہو کر پہلے تالیاں بجائیں اور پھر قہقہے لگائے۔ کتے کی غراہٹ اور ان کے قہقہوں کی آوازوں سے قیدی کے ذہن کی رگیں پھٹنے لگیں۔ اس کا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا گیا۔
دو گھنٹے، چار گھنٹے، ایک دن، دو دن یا پھر کئی دن...... پتہ نہیں کب تک اس پر بیہوشی طاری رہی؟ قیدی کو کچھ یاد نہیں تھا۔ لیکن جب آنکھ کھلی تو سارا منظر بدل چکا تھا۔ اس کے ساتھی کہیں جا چکے تھے اور وہ تنہا بیٹھی محبت کش نظروں سے اسے گھور رہی تھی۔ وہ یکدم بدلی بدلی سی نظر آئی۔ کتا زمین سے چپکا بے خبر سو رہا تھا۔ قیدی کے سامنے کھانے پینے کی چیزوں سے بھری ہوئی پلیٹ اور پانی کا گلاس رکھا تھا۔
''تم بہت بھوکے ہو، کچھ کھا لو۔'' عورت کے لہجے میں نرمی اور محبت تھی۔ لیکن اس کے جسم میں جنبش نہیں ہوئی۔ چہرہ اتنا سوج گیا تھا کہ آنکھوں کی پتلیاں تک چھپ گئی تھیں۔ بھوک کا احساس فنا ہو چکا تھا۔ اذیت سے کہیں زیادہ ذلت کا احساس کچوکے لگا رہا تھا۔
وہ خاموش رہا۔ عورت بولی۔ ''اب سب بھول جاؤ۔ اب ہم پیار و محبت کی باتیں

کریں گے۔"

عورت جیسے اس کو رجھانے پر تلی ہوئی تھی۔ نرم لہجے میں کہتی رہی۔ "مجھ کو رزمیہ گیت سناؤ، جو تم لوگ نیلگوں کھلے آسمان کے نیچے، جلتے ہوئے الاؤ کے گرد بیٹھ کر گاتے ہو۔ جس میں تمہاری نسلوں کی بہادریوں کے کارنامے شامل ہوں اور جدائی کی تڑپ بھی اور نشیلی راتوں کا خمار بھی......"

قیدی کو اپنا لباس یاد آیا۔ جس میں ایک تصویر تھی، تصویر میں اس کی بیوی اور دونوں بچے مسکرا رہے تھے۔ جنگ کے دوران وہی تصویر اس کی راتوں کو نیند اور دل کو سکون بخشتی رہی تھی۔

دفعتاً عورت اپنی جگہ سے اٹھی اور اس کے زخموں سے بھرے ہوئے جسم پر انگلیاں پھیرنے لگی۔ قیدی کی زخمی نسیں پھڑکیں۔ اس کو یوں لگا جیسے کئی نوزائدہ لجلجے سپولے اس کے جسم میں رینگ رہے ہوں۔ وہ پھر بولی۔ "تمہارے جیسا مرد میں نے آج تک نہیں دیکھا، تمہیں تو ورلڈ ریسلنگ گروپ میں شامل ہونا چاہئے تھا...... تم یہ کہاں آ گئے؟"

وہ خاموش رہا اور وہ بولتی رہی۔ آہستہ آہستہ اس کے لمبے لمبے ناخن والی انگلیاں جسم کے مختلف حصوں پر رینگتی رہیں اور پھر سینے پر لگے ہوئے ایک گھاؤ پر اس کی انگلیاں ساکت ہو گئیں۔ لمحہ بھر کے لئے ایک شیطانی مسکراہٹ ہونٹوں پر جھلملائی اور پھر دانت پیستے ہوئے اس نے اپنی ایک انگلی کے ناخن کو گھاؤ کی گہرائی میں دھنسا دیا۔ قیدی تڑپا، بے ساختہ ایک دبی دبی سی چیخ اس کے حلق میں اٹک کر رہ گئی اور اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔

کئی ہفتے گزر گئے۔

نئے نئے طریقے سے ایذا پہنچانے کا سلسلہ نہیں رکا۔ پتہ نہیں، قیدی کس مٹی کا بنا ہوا تھا کہ اپنی زبان ہی نہیں کھولی؟ عورت کے لئے تو اس کی بے زبانی وقار کا مسئلہ بن کر رہ گئی تھی۔ وہ ہتک محسوس کر رہی تھی۔ ہر قسم کے حربے آزما لینے کے باوجود قیدی سے ایک لفظ بھی اگلوا نہ سکی تھی۔

اور پھر اچانک حالات بدل گئے۔

ہیڈ کوارٹرز میں کچھ ایسی اتھل پتھل مچی کہ پرانی ٹیموں کو واپس لوٹنے کا حکم مل گیا۔ اس کی جگہ نئی ٹیم آئی تو ان کی حکمت عملی کچھ اور تھی۔ بہت سے قیدیوں کو رہا کر دیا گیا۔ اس کو بھی رہائی مل گئی۔ رہائی سے پہلے دوائیں، غذا اور لباس دیا گیا۔

"یہ تصویر تمہارے کپڑوں میں ملی تھی۔" نئی ٹیم کے انچارج نے اس کی بیوی کی تصویر حوالے کی تو اسے سکون کا احساس ہوا۔ تصویر جیب میں رکھتے ہوئے اس نے انچارج کی طرف دیکھا، جس کے لبوں پر ایک نرم سی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ نیا انچارج بولا۔ "ان لوگوں کا کہنا ہے کہ تم نے آج تک کوئی بات نہیں کی۔ تمہیں رہائی مل چکی ہے۔ اس موقع پر ایک دو فقرے

ہی سہی، بول جاؤ تا کہ ان کو معلوم ہو کہ ایک گونگے کو اتنے دنوں تک قید میں نہیں رکھا تھا۔"

قیدی نے سر پھیر کر پرانی ٹیم کو دیکھا۔ عورت ایک کرسی پر اکڑوں بیٹھی تھی اور اس کی نگاہیں اسی پر مرکوز تھیں۔ اس کا کتا قدموں میں لیٹا اس کے پاؤں کی انگلیوں کو چاٹ رہا تھا۔ عورت کا چہرہ اس وقت بالکل سپاٹ تھا...... جذبات سے عاری۔

قیدی نے لمحہ بھر تک عورت کو دیکھا۔ اپنے جسم کو ایک ہلکا سا جھٹکا دے کر جانے کے لئے پلٹا۔ پہلا قدم اُٹھانے سے پہلے قیدی نے کہا۔

"سن آف اے بچ۔"

اونچی آواز سے کھنکار کر اس نے زمین پر تھوک دیا تھا۔

OO

CENTRAL COUNCIL FOR RESEARCH IN UNANI MEDICINE

Ministry of Health & Family Welfare, Government Of India
Department of AYUSH

THE COUNCIL

The Central Council for Research in Unani Medicine (CCRUM) is an autonomous organization under the Ministry of Health and Family Welfare, Government of India, Department of AYUSH. Since its establishment in 1979 the CCRUM has been busy researching into various fundamental and applied aspects of Unani Medicine, and over the years emerged as the world-leader in the field.

THE NETWORK

20 Research Centres of the Council are functioning in different parts of the Country.

THE AREA OF ACTIVITY

The Research Programme of the Council has four major components

- ✓Clinical Research
- ✓Drug Standardization
- ✓Literary Research
- ✓Survey and Cultivation of Medicinal Plants

CLINICAL RESEARCH

- Has developed 24 Unani Drugs, which are purely natural, Standardized and without any side-effects, for successful treatment of leucoderma, sinusitis, viral hepatitis, eczema, Malaria, rheumatoid arthritis and bronchial asthma.
- Has field patents on seven on these drugs

DRUG STANDARDIZATION

- Has evolved standards of 222 single and 385 compound unani drugs
- Has signed a Memorandum of Understanding with Council of Scientific and Industrial Research (CSIR) for taking up advanced research in the field of drug development

SURVEY & CULTIVATION OF MEDICINAL PLANTS

- Has collected 59462 specimens of 1730 medicinal plants from the wild.
- Undertaking successful cultivation of four important medicinal species.
- Has gathered and documented 6650 folk medicinal claims

PUBLICATIONS

- Has produced over 1000 research papers and brought out 116 Research publications, besides a regular publication of a bi- monthly CCRUM Newsletter, Quarterly Urdu Journal Jahan-e-Tib and Annual Report.

For further information please contact
Director
CENTRAL COUNCIL FOR RESEARCH IN UNANI MEDICINE
Ministry of Health & Family Welfare, Government of India, Department of AYUSH
61-61 Institutional Area, Janakpuri, New Delhi – 110 058, (INDIA)
Tel: 91-11-28521981. Fax: 91-11-28522965
E-mail: ccrum@rediffmail.com & unanimedicine@gmail.com
Web site: http:// www.ccrum.org

فرحت پروین

کہانی

تمغہ

عجیب بات ہے یہ تجربہ ہر بار اتنا ہی نیا، اتنا ہی امنگ بھرا اور پر جوش ہوتا ہے۔ ہر چیز کیسی روشن اور خوبصورت لگنے لگتی ہے۔ محبت شاید وہ پیلے شیشوں والی عینک ہے جو ٹیپو امریکہ سے لایا ہے، جس کے لگاتے ہی جیسے ہزاروں سورج پوری دنیا کو روشن کردیتے ہیں اور طبیعت خود بخود ترنگ میں آجاتی ہے۔ نہیں، محبت شاید وہ کلائیڈوسکوپ ہے جس میں سے دیکھنے پر رنگ اور زاویے کیسی کیسی خوبصورت تصویریں بناتے ہیں، مردہ رنگ کیسے جی اٹھتے ہیں اور بے جان زاویے کیا کیا روپ بدلتے ہیں کہ نظر ہٹتی ہی نہیں۔

آج عثمان کی آنکھوں میں بھی ہزاروں سورج جگمگا رہے تھے۔ ایسی چکا چوند کہ کسی ایک چیز پر نظر ٹکانا مشکل ہو رہا تھا۔ ادھر رنگوں کی برسات بھگوئے دے رہی تھی، یوں جیسے کسی جادو نگری میں آنکلا ہو۔ وہ ابھی فیعونہ کو اس کے گھر اتار کر آیا تھا۔ وہ آج پہلی بار اس کے ساتھ ریسٹورنٹ کھانے پر گئی تھی۔ تو .... گویا سلسلہ چل نکلا تھا۔

فیعونہ سے اس کی ملاقات دو ماہ پہلے ہوئی تھی۔ اس کے دوست اختر نے جو بیرون ملک رہتا تھا، فیعونہ کی سفارش کی تھی کہ اس کے ان لوگوں سے پرانے خاندانی مراسم ہیں۔ کچھ جائیداد وغیرہ کے سلسلے میں انہیں قانونی مشورہ چاہیے۔ اس نے اسے تاکید کی تھی کہ ”یار اسے میرا کام سمجھ کر کردو۔ بے شک فیس وغیرہ اپنی مرضی کی لینا مگر کام خصوصی توجہ سے کرنا۔ میں نے ان سے تمہارا ذکر کردیا ہے۔ یہ فون نمبر لے لو۔“ اس نے کارڈ میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔ ”میں خود ساتھ چل کر تمہارا تعارف کرادیتا مگر میرے پاس وقت نہیں ہے۔ بہت کام ہے۔ ہاں، کہو تو اپوائنٹ منٹ کردوں۔“

”نہیں میں خود ہی بات کرلوں گا۔ تم بے فکر ہو جاؤ۔“

اختر کے جانے کے بعد اس نے کارڈ دیکھا۔ ”فیعونہ سرکار“ نام تو خوبصورت بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ وہ مسکرادیا۔ پتہ پڑھا تو مسکراہٹ غائب ہوگئی۔ وہ ایک بہت بڑی غیر ملکی

فرم "یمسن اینڈ جیکسن" میں سسٹم انیلسٹ تھی۔ اس کے ذہن میں ایک معتبر اور مغرور خاتون کا سراپا اُبھرا مگر اس سے رابطہ تو بہر حال کرنا ہی تھا۔ اس نے فون ملایا۔ ایک ملائم سریلی آواز اُبھری۔ "یس۔" غالباً آپریٹر تھی۔

"میں فیعونہ سرکار سے بات کر سکتا ہوں۔" اس نے بھی انگریزی میں کہا۔

"فیعونہ اسپیکنگ۔" اس آواز نے جواب دیا۔

چند لمحوں کے لیے تو وہ جیسے سُن سا ہو گیا۔ پھر اس نے اپنا اعتماد مجتمع کر کے بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اپنا تعارف کرایا۔ ملاقات کا وقت طے ہو گیا۔ فون بند ہو گیا مگر فضاؤں میں دیر تک جل ترنگ سے بجتے رہے۔ "ویسے آواز پر نہیں جانا چاہئے۔" اس نے سوچا اور اس کا تو اسے تجربہ بھی تھا۔

اس کے آفس کے ٹھاٹھ باٹھ دیکھ کر تو اس کی ہمت ہی جواب دے گئی۔ "خیر مجھے کیا، میری تو مؤکلہ ہے۔" اس نے خود کو تسلی دی۔

سامنے کشمیری پشمینے جیسی ملائم لڑکی بیٹھی تھی، بالکل اپنی آواز جیسی۔ "بڑی اونچی سرکار ہے یہ تو۔" اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ "اللہ تیرا بھلا کرے اختر، اپنی تو لاٹری نکل آئی۔" اس نے دل سے سوچا۔

مگر رسمی پیشہ وارانہ مسکراہٹ چہرے پر سجائے بڑی سنجیدگی اور وقار سے بیٹھا رہا۔ تجربے سے ثابت ہوتا تھا کہ ایک دم بے تکلفی کا مظاہرہ کرنے سے لڑکیاں کھٹک جاتی ہیں اور اپنا دفاعی الارم آن کر دیتی ہیں۔ اس معاملے میں دھیرج سے کام لینا ہی اچھا ہوتا ہے۔ "سہج پکے سو میٹھا" کے صحیح معنی اسے اسی طرح سمجھ میں آئے تھے۔

نہ صرف یہ کہ اس کی آواز خوبصورت تھی بلکہ، انداز بھی من موہنا تھا۔ وہ اسے کیس بتاتی رہی۔ اس نے خاک بھی نہیں سنا۔ بس اس کی آواز کے زیر و بم سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ نظر بھر کے تو نہیں دیکھا مگر سرسری نگاہ میں ہی اندازہ ہو گیا کہ مؤکلہ حسین بھی ہے اور دلنشین بھی۔

"مکان کس کے نام ہے؟" عثمان نے سوال کیا۔

"میری والدہ کے نام۔"

"پھر تو ان سے ملنا بہت ضروری ہے۔"

"کب؟ کہاں؟ آپ بتائیے میں لے آؤں گی۔"

"نہیں، نہیں، انہیں تکلیف نہ دیں۔ میں حاضر ہو جاؤں گا۔" وہ سراپا انکسار تھا۔

"بہت شکریہ، ہم شام کو عموماً گھر پر ہی ہوتے ہیں۔"

دوسری شام ان کی والدہ سے مل کر تفصیل معلوم ہوئی۔ ان کی چھ کنال کی کوٹھی کا کرایہ دار انہیں گزشتہ کئی ماہ سے کرایہ نہیں دے رہا تھا۔ بارہا نوٹس دیئے مگر وہ خاطر میں نہ لایا۔ بلکہ اس نے کوٹھی کا آدھا حصہ کرائے پر اٹھا دیا تھا، جس کا کرایہ وہ خود وصول کر رہا تھا۔ آخر کار فیعونہ خود بات کرنے گئی، تو اس نے نہ صرف کرایہ دینے یا مکان خالی کرنے سے انکار کر دیا بلکہ جھگڑا بھی کیا اور دھمکیاں بھی دیں۔ عثمان نے انہیں تسلی دی اور تحقیقات کے بعد ملنے کا کہہ کر رخصت ہو گیا۔

ملاقات مختصر تھی اور زیادہ وقت اس کی والدہ ہی بولتی رہی تھیں۔ واپسی میں وہ فیعونہ کے متعلق سوچنے لگا۔ اسے زیادہ خود اعتماد اور انٹلکچوئل لڑکیاں پسند نہیں تھیں۔ ایک تو ان میں نسوانیت برائے نام رہ جاتی ہے۔ دوسرے ہر بات میں بحث، ہر بات پر حجت، ہر بات میں دلیل اور منطق۔ ایسی لڑکیوں سے صرف بات چیت اور گپ شپ کی حد تک دوستی اچھی رہتی ہے کہ وہ ہر موضوع پر کھل کر بات کر لیتی ہیں۔ حالات حاضرہ سے لے کر جنس تک۔ لڑکیوں کے منہ سے ایسی باتیں سن کر دل میں گدگدی سی ہونے لگتی ہے جبکہ وہ اپنے انٹلکچوئل پن کے زعم میں بڑی خود اعتمادی سے بالکل غیر متعلق اور بے تاثر چہرہ لیے کسی ریکارڈ کی طرح بجے چلی جاتی ہیں۔ اپنی علمیت اور جدیت جتانے کے لیے۔ معلوم نہیں اب یہ کشمیری پشمینے کی بلی کس قبیل سے ہے، بہر حال اسے دیکھنا اور اس کی آواز سننا بجائے خود ایک مسرت تھی۔

وہ ان کے کرایہ دار سے ملنے کے بعد ان سے ملا اور انہیں پورے حالات اور ایسے تمام امکانات سے خبر دار کیا جو ایسی صورتِ حال میں پیش آ سکتے تھے اور یہ کہ لوگ آج کل کیا کیا ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں۔ یہ سب سن کر وہ پریشان ہو گئی۔ وہ فکر مند سی، بالکل سہمی ہوئی چڑیا لگ رہی تھی۔ مسرت کی ایک گرم لہر عثمان کی ریڑھ کی ہڈی میں اترتی چلی گئی۔

"پھر، ہمیں کیا کرنا چاہیے؟" فیعونہ نے سوال کیا۔

اس کی چھاتی گزوں چوڑی ہو گئی۔ اس کا دل چاہا وہ سائبان بن کر تن جائے اور اسے ہر سرد و گرم سے بچالے۔

"میرے ہوتے ہوئے آپ کو فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ سامنے ہی نہ آئیں۔ میں سب سنبھال لوں گا۔"

فیعونہ کے چہرے سے خوف کے سائے چھٹنے لگے اور اس نے اسے یوں دیکھا جیسے ننھی بچی انگلی پکڑ کر سڑک پار کرانے والے کو دیکھتی ہے۔ اس کی یہ ادا عثمان کو لوٹ لے گئی۔

وہ تو سمجھا تھا پڑھی لکھی ہے، ملازمت کرتی ہے، وہ بھی اتنے اچھے عہدے پر۔ وہ بھی ان

خود کفیل لڑکیوں جیسی ہو گی جنہوں نے مردوں کو مرد ہونے کے غرور سے محروم کر دیا ہے۔ مگر یہ مصری کی ڈلی تو بھولی فاختہ تھی۔

وہ آتا جاتا رہا۔ کبھی کوئی کاغذ دستخط کرانے، کبھی تازہ حالات بتانے، اور پھر ان بہانوں کی بھی ضرورت نہ رہی۔ وہ ان کے کئی اور ذاتی کاموں میں بھی ہاتھ بٹانے لگا اور ان کا انحصار عثمان پر بڑھتا گیا۔

آج وہ ان کے ہاں گیا۔ "میں ادھر سے گزر رہا تھا، سوچا خیریت معلوم کرتا جاؤں۔ میرے لائق کوئی خدمت؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں شکریہ۔" فیعونہ الجھی الجھی سی بیٹھی تھی۔

"آپ کچھ پریشان سی لگ رہی ہیں۔ خیریت تو ہے نا؟"

اس نے بتایا۔ "آج دفتر میں ایک کولیگ سے گڑبڑ ہو گئی۔ گھر آئی تو امی کی طبیعت خراب تھی۔ انہیں ڈاکٹر کے پاس لے گئی۔ اوپر سے چھوٹی بہن کا موڈ خراب ہے کہ اس کے کالج میں فنکشن تھا جس میں وہ نہیں جا سکی کیونکہ میں اسے پہنچا نہیں سکی۔"

"کبھی کبھی میں بہت تھک جاتی ہوں اس دو طرفہ دباؤ سے۔" وہ اکتائے ہوئے لہجے میں بولی۔

واقعہ یہ تھا کہ فیعونہ کی ماں سیدھی سادی ان پڑھ عورت تھیں۔ باپ بیرون ملک رہتا تھا۔ بھائی کوئی تھا نہیں۔ دو چھوٹی بہنیں کالج میں پڑھ رہی تھیں۔ پوری ذمہ داری فیعونہ پر ہی تھی۔ اسے فیعونہ پر ٹوٹ کے پیار آیا۔

"اب آپ کے والد کو واپس آجانا چاہئے۔ جوان لڑکیوں کی خاطر۔ آپ لوگوں کو ان کی ضرورت ہے۔" اس نے پورے خلوص سے کہا۔

"وہ جوان لڑکیوں کی خاطر ہی باہر رہ رہے ہیں کیونکہ انہیں معلوم ہے کہ روپیہ کتنی بڑی ضرورت ہے۔"

"آپ ذہن پر بوجھ بہت لیتی ہیں۔ کبھی ذہن کو آرام بھی دیا کریں۔ آپ پر بہت ذمہ داری ہے۔ آپ تو مرد ہیں اس گھر کا۔"

وہ خاموش رہی۔

"چلیں، تھوڑی دیر کہیں باہر چل کر بیٹھتے ہیں۔ ذرا ماحول بدلے گا تو آپ کے اعصاب سکون پذیر ہو جائیں گے۔"

کہنے کو تو اس نے کہہ دیا مگر اسے یقین تھا کہ وہ کوئی نہ کوئی عذر کر دے گی۔

"چلیں ٹھیک ہے۔" اس نے آہستگی سے کہا اور جانے کو اٹھ کھڑی ہوئی۔
اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ "اف! بعض دفعہ خود کو نارمل اور سنجیدہ رکھنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔" اس نے سوچا۔
راستے میں عثمان نے کہا۔ "کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ میرا کہنا نہ ٹالنے کے لیے آگئی ہوں۔ میں تو آپ کی خاطر کہہ رہا تھا۔ موڈ نہ ہو تو واپس چلتے ہیں۔"
"نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔" وہ بدستور سنجیدہ تھی۔
مگر ریسٹورینٹ میں پہنچ کر اس کا موڈ واقعی بدل گیا۔ وہ بہت شگفتہ اور تروتازہ نظر آنے لگی۔
"آپ بہت معصوم ہیں۔ آپ کو زمانے کی ہوا بالکل نہیں لگی۔ حیرت ہے۔"
وہ چپ رہی۔ مگر عثمان نے دیکھا کہ اس کے الفاظ فیونہ کی آنکھوں میں دمکے، ہونٹوں کے کونوں میں مسکرائے اور رنگ بن کر رخساروں پر بکھر گئے۔
"آپ دوسروں سے بہت مختلف ہیں۔" اس نے بڑے گہرے لہجے میں کہا۔
وہی چمکیلی کرن پھر اس کی آنکھوں میں ستارے بھرتی، ہونٹوں پر پھول کھلاتی، رخساروں پر شفق بکھیر گئی۔ تیر نشانے پر لگا تھا۔ ویسے یہ تیر آج تک کبھی خطا نہیں گیا تھا۔ پتہ نہیں ہر لڑکی کو مختلف ہونے کا شوق کیوں ہوتا ہے۔ پہلے اسے اس بات پر ہنسی آتی تھی مگر اب وہ دل سے یقین کرنے لگا تھا کہ ہر لڑکی مختلف ہوتی ہے۔ کسی کی مسکراہٹ خوبصورت ہوتی ہے۔ کسی کی آنکھیں اور کسی کے بال۔
"آپ خود بھی دوسروں سے بہت مختلف ہیں۔ کون کسی کے لیے اتنا کرتا ہے۔ اگر آپ نہ ہوتے تو پتہ نہیں کیا ہوتا۔"
عثمان کا کلیجہ ہاتھ بھر کا ہو گیا۔ "کیوں نہ ہوتا میں۔ ارے کسی کی مجال ہے جو آپ کا بال بھی بیکا کر سکے۔ میری لاش پر سے گزر کر ہی کوئی ایسا کر سکتا ہے۔"
"خدا نہ کرے، یہ کوئی کرنے کی بات ہے۔"
"نہیں کریں گے سرکار۔" عثمان شرارت سے بولا۔
"لاسٹ نیم ہے میرا۔" وہ مسکرائی۔
جانتے ہیں سرکار۔"
اور وہ دونوں ہنس دیے۔
فیونہ کو گھر اتارنے کے بعد ایک عجیب سی بے کلی نے اسے آلیا۔ ایک اُبال تھا جو سینے

میں سما نہیں رہا تھا۔ تھوڑی دیر تو وہ سڑکوں پر بلا مقصد گاڑی دوڑاتا رہا اور پھر اس نے گاڑی سلیم کے دفتر کی طرف موڑ دی۔ سلیم سے اس کی خاصی جان پہچان تھی مگر دوستی نہیں تھی۔ وہ کافی دنوں بعد ادھر گیا تھا۔

"آیئے آیئے، آج ادھر کیسے؟" سلیم بولا۔

"بس یار، ادھر سے گزر رہا تھا، سوچا ملتا جاؤں۔"

"نوازش ہے جناب، چائے منگاؤں یا ٹھنڈا۔"

"کچھ نہیں یار، مجھے جلدی ہے۔ میں ذرا تمہارا فون استعمال کرلوں۔"

"ضرور، ضرور۔"

اس نے فیعونہ کا نمبر ملالیا۔ "سب خیریت ہے نا۔ امی کی طبیعت اب کیسی ہے؟ اب آپ کیسا محسوس کر رہی ہیں؟ میں نے کہا تھا نا...... ہاں! میں نے آپ کو چند ضروری باتیں بتانی تھیں، یاد ہی نہیں رہا...... نہیں، نہیں اس وقت تو ذرا جلدی ہے...... میں نے کسی کو ٹائم دے رکھا ہے نا...... تھوڑی دیر میں بات کروں گا...... گھر پر ہی ہوں گی نا...... اچھا خدا حافظ۔"

گفتگو کا انداز صاف چغلی کھا رہا تھا۔ سلیم معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

"بڑی اچھی لڑکی ہے یمسن اینڈ جیکسن میں سسٹم اسسٹنٹ ہے۔ فیعونہ نام ہے۔ مجھے خیال ہی نہیں رہا تمہاری بھی بات کراتا۔"

"اچھا تو یہ عیش ہیں۔"

"نہیں، نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔" عثمان نے اقرار نما انکار کیا۔

سلیم کی آنکھوں میں رشک و حسد سلگنے لگا۔ "لمبا ہاتھ مارا ہے یار۔"

"اچھا یار چلتا ہوں۔"

اب اسے معلوم تھا کہ اسے کہاں جانا ہے اور جلد ہی وہ جاوید کے دفتر میں تھا۔ وہاں سے اس نے پھر فیعونہ کو فون کیا۔

"میں نے سوچا آپ انتظار کر رہی ہوں گی۔ میں ذرا مصروف ہوں...... آپ کو کہیں جانا ہو تو بے شک چلی جائیں...... نہیں جانا...... تو پھر میں آدھے گھنٹے میں فون کرتا ہوں...... نہیں، نہیں پریشانی کی کوئی بات نہیں۔"

اور جاوید کے استفسار پر فیعونہ کا غائبانہ تفصیلی تعارف اس سے بھی کر دیا اور وہاں سے روانہ ہو گیا اور اب اس کا رخ اطہر کی طرف تھا۔ اطہر کے ہاں سے وہ فیعونہ کو فون پر بتا رہا تھا۔
"میرے سر میں شدید درد ہے، اس لیے میں نے میٹنگ کینسل کر دی ہے...... نہیں، نہیں

آپ فکر نہ کریں۔ میں بس اب گھر ہی جا رہا ہوں۔ ہاں ہاں دوائی بھی کھاؤں گا...... ٹھیک ہے آرام بھی کروں گا...... پھر آج آپ میرے فون کا انتظار نہ کیجئے گا...... کل میں خود حاضر ہو جاؤں گا سرکار......"

اور اطہر کے تجسس پر اس نے اسے بھی بتایا کہ وہ کون ہے کیا نام ہے۔ کیا کام کرتی ہے۔

"تو یہ بات ہے، میں بھی کہوں۔ آج کل کہاں غائب ہیں حضور۔ کیا چکر چل رہا ہے۔" اس کے دوست نے چھیڑا۔

"کوئی چکر نہیں یار، مؤکلہ ہے میری۔ بڑی اچھی لڑکی ہے۔"

"تو یہ بات ہے۔" اطہر نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔

"ایسی کوئی بات نہیں یار۔" عثمان نے جھوٹ موٹ انکار کیا۔

"من خوب می شناسم پیران پارسا را" اطہر آنکھ دبا کر مسکراتے ہوئے گنگنایا۔ "کاش میں بھی وکیل ہوتا۔"

اطہر رشک سے بولا۔

"گڈ لک یار۔"

"تھینک یو۔" اور وہ مسکراتا ہوا نکل گیا۔

گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اسے سلیم، جاوید اور اطہر کے تاثرات یاد آئے۔ سلیم تو جل مرا ہوگا۔ رشک تو اطہر کو بھی بہت آ رہا تھا۔ جاوید نے متین رہنے کی کوشش تو بہت کی مگر چہرے کے تاثرات تو وہ بھی نہ چھپا سکا تھا۔ اب یہ خبر تو سارے حلقے میں پھیلی سمجھو۔ اسے ہلکے سے غرور کا احساس ہوا۔

اب اسے جیسے قرار آگیا تھا۔ اس کے اندر کا اُبال سکون پذیر ہو گیا تھا اور وہ بڑی متوازن رفتار سے گاڑی چلاتا ہوا گھر کی طرف جا رہا تھا۔ OO

سیّدہ عفراء بخاری

کہانی
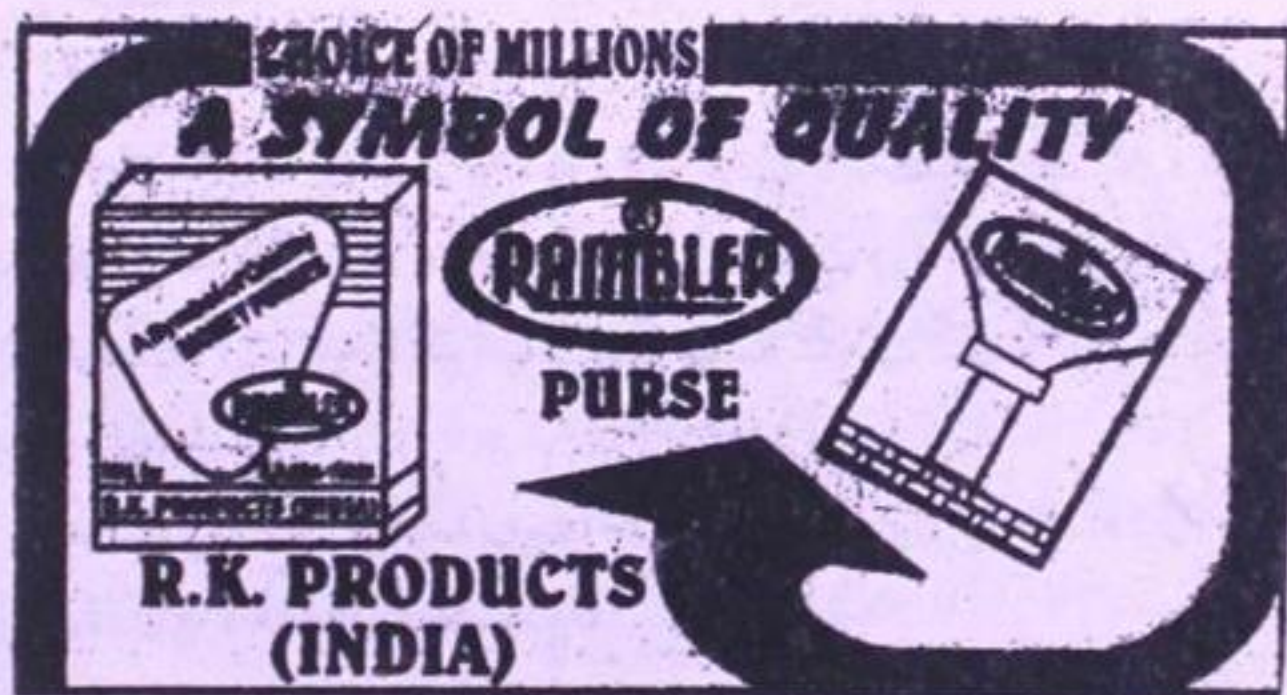
اندھیرے کا سفر

کنکنا سا پانی تھا۔

نہ زیادہ گرم نہ بہت ٹھنڈا...... بالکل آرام دہ۔

اور وہ ایک سبک پن کے ساتھ آنکھیں موندے، اپنا جسم ڈھیلا چھوڑے، نرم دیواروں کے بیچ میں کسی خوبصورت سنہری مچھلی کی طرح تیر رہا تھا۔

پانی کے نرم ہلکورے اسے جھولا سا جھلا رہے تھے۔

یہ ایک ہنڈولنا تھا اور اس میں یوں مکمل سپردگی کے عالم میں ڈھیلے پن سے کسی تابع معمول کی مانند پڑے رہنا کتنا آرام دہ تھا۔ کسی سختی کا وہاں کوئی احساس نہیں تھا۔ اس کے گرد محبت کا ایک ہالہ مخمل کی سی لطافت اور گداز پن لیے جیسے کسی نے اسے روئی کے گالے میں نرمی، محبت اور حفاظت کے ساتھ لپیٹ رکھا ہو...... یہ لمس اور احساس کی جگہ تھی، جہاں آگہی کا واسطہ لمس ہی تھا۔

اس لمس میں ایک آواز تھی...... مدھر رسیلی آواز، رگ رگ میں اتر جانے والی آواز...... محبت کی سرگوشی، جذبات سے بھرپور، سرشار کردینے والی۔ ایک خوشبو...... محبت اور شوق کی مہک، ایک آہٹ، ایک دھڑکن جو کسی کے بہت قریب ہونے کا، کسی کے بہت اپنا ہونے کا لطیف احساس دلاتی اور زندگی اس کے اندر لہریں لینے لگتی۔ ایک ہل چل مچ جاتی اور وہ جوش و خروش سے لبریز محبت کی اتھاہ گہرائیوں میں اتر جاتا اور اپنی محبت کو دیکھنے، محسوس کرنے کی کوشش میں تیزی سے متحرک ہو جاتا۔ مسرت سے کلکاریاں مارتا، رکتا، چلتا اور جذبوں کی انتہائی شدت میں بے دم ہو جاتا۔

کوئی تھا...... بہت قریب، بہت ہی اپنا سا، یوں جیسے وہ خود اس کے وجود میں سمویا ہو، اسی کا ایک حصہ ہو۔ اس کی سانس میں اس کی سانس چلتی ہو اور اس کی دھڑکن میں اس کا دل دھڑکتا ہو۔ وہ اسے دیکھنا چاہتا تھا مگر دونوں کے بیچ میں ایک غیر مرئی پردہ حائل تھا۔ شاید اسی لیے اس کی تمام حسیات لمس کی سرگوشی میں سمٹ گئی تھیں۔ وہ اس لمس کی آواز کے لیے بے چین رہتا

جو اتنی نرم اور ملائم تھی جیسے کانچ کو فاختہ کے نرم پر سے چھو دیا جائے۔ اس کا رواں رواں مسرت وانبساط سے کانپنے لگتا۔ وہ بڑی وارفتگی سے اس کی طرف کھنچتا گیا۔

یہ اس کے قریب تر ہونے اور اس کو پالینے کی دیوانی خواہش تھی یا شاید تکمیل کی بے صبر آرزو۔ یہ کیسی کشش تھی جو مقناطیس کی طرح اسے اپنی طرف کھینچتی تھی؟ اور وہ خود سپردگی میں پانی کے اندر ہی اندر حرکت کرتا تھا۔ اس کی تلاش میں بے چینی اور اضطراب تھا۔ وہ کسی تشنہ لب کی طرح بے صبر ہو جاتا اور بے خودی میں اپنا سر اونچا کرتا، اسے دیکھنے کی خواہش میں وہ بے چین ہو جاتا۔ اس کی نبض تیز چلتی اور دل زور سے دھڑکتا۔ پھر سرخوشی میں وہ کنکنے پانی میں کلکاریاں مارتا اور خوشی کے ملکوتی نغمے الاپتا۔ جذبات کی عمیق ترین گہرائیوں کو چھو لینے والے لمس کا انتظار کرتا۔ ہر لمحے، ہر پل اس کے وجود کا ہر موا اس کا منتظر رہتا۔ لمس کی یہ مدھر آواز کہاں سے آتی تھی۔ جیسے اس کے اپنے ہی وجود کے کسی دوسرے انجانے حصے سے آتی۔ گویا اس کی اپنی ہی آواز...... جسے وہ سنتا تھا۔

اس کے گلابی ہونٹ اکثر اسے محسوس کر کے مسکرا دیتے...... ہلکا سا لمس جو تھوڑی دیر کے لیے اس پر ٹھہرا رہتا...... وہ خوشی سے کسمساتا، کبھی اسے محسوس ہوتا جیسے وہ کسی کے ساتھ محو سفر ہے۔ تھوڑی سی بے آرامی...... وہ تھوڑا بے چین اور چوکنا ہو جاتا۔ ایک ہلکے سے خوف اور خطرے کو محسوس کر کے سنبھل جاتا، سمٹ جاتا۔ کچھ عجیب قسم کی واردات ہوتی۔ وہ فوراً نرم دیواروں سے چمٹ جاتا...... تبھی اسے کوئی چھوتا ہوا محسوس ہوتا۔ چاندی کے گھنگھرو بج اٹھتے۔ فاختہ اپنے ملائم پروں کو اپنی چونچ سے سنوارتی، وہ سنبھل جاتا۔ سارے اندیشے کہاں غائب ہو جاتے۔

خوشی اور تحفظ کا یہ لمحہ کتنا انمول اور انوکھا تھا۔

گلاب کی پنکھڑی جیسے نازک ہونٹ مسکرا پڑے۔ اس لمس میں محبت کی جو گھلاوٹ تھی، اسے وہ اپنے اندر اترتا محسوس کرتا۔ ایک خوشی اور سکون سے وہ اپنا سر اس وجود کے ساتھ لگا دیتا۔

وہ کون تھا......؟ اسے معلوم نہیں تھا۔

یہ ایک چھوٹی سی تنگ جگہ تھی جہاں صرف اندھیرا اور پانی تھا یا لمس کی پراسرار ریشمی سرسراہٹ۔ وہ اس اندھیرے میں اپنی ابتدا و انتہا سے بے خبر، عالم انبساط میں سکڑا سمٹا تکمیل کے مدارج میں تھا۔ اپنے ہی وجود کے کسی دوسرے حصے کو پانے اور دیکھنے کی خواہش سے بھرپور۔ آنے والے لمحوں کا اسے کوئی ادراک نہیں تھا۔

اندھیرے کا یہ صبر آزما سفر ابھی کچھ باقی تھا اور وہ، ایک ابدی سکون میں، تمام حسیات و جزئیات کے ساتھ ایک مکمل سانس لیتا وجود روشنی کا منتظر تھا......

جب اچانک کنکنے آرام دہ پانی میں کچھ گدلاہٹ اور بھاری پن پیدا ہو گیا اور اسے اپنا سانس رکتا محسوس ہوا۔ یہ نئی واردات اس کے فہم و ادراک سے بالا تھی۔ اس نے صرف تکلیف اور اذیت محسوس کی۔ اسے یوں لگا جیسے کوئی قوت بڑی بے رحمی سے اسے ان نرم محفوظ دیواروں سے پرے کھینچ رہی ہے اور وہ اس طاقت کے سامنے ایک بے وزن تنکے کی مانند بے بس و بے اختیار ہے۔ وہ اپنے بچاؤ کے لیے بے آب مچھلی کی طرح تڑپا۔

ایک ہلچل سی مچ گئی۔ پانی مزید گدلا اور بھاری ہو گیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں اینٹھنے لگے، ہونٹ بھنچ گئے......اور سانس اکھڑ گیا۔ وہ اس گھور اندھیرے میں بے بسی سے زندگی کے لیے چیخا، مگر یہ جان کر دم بخود رہ گیا کہ اس کے اندر کوئی آواز نہیں تھی...... اس نے اپنے کھنچتے، گھٹتے، بے قابو وجود کو بچانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنا چاہے مگر اس کے ہاتھ پاؤں پانی کے غلاف میں بند تھے۔ وہ بالکل بے دست و پا تھا اور بے اختیار ایک سمت کو کھنچتا جا رہا تھا۔ اس نے بالکل لاچار ہو کر اپنا وجود ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اب وہ اس انجانی قوت کے رحم و کرم پر تھا۔ وہ لمبے اکھڑے سانس لے رہا تھا۔ تکلیف کی شدت سے اس کی چھوٹی سی پیازی زبان ہونٹوں سے باہر آ گئی۔ فریادی آنکھیں آسمان کی طرف گئیں اور دہانہ نیم وا رہ گیا...... کسی نے بڑی سفاکی سے اس کے وجود کو اس سے الگ کر دیا۔ وہ یکلخت نرم گرم پانی سے اوندھے منہ کسی یخ بستہ منجمد فضا میں جا گرا۔

○

ایک لمحے کے لیے اس کی سانس غائب ہو گئی تھی...... جس طرح اباجی نے ایک دن اللہ ہو کا ورد کرتے ہوئے سانس اندر کو کھینچی تو پھر واپس نہ آ سکی...... مگر یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ نرم دل نرس اس کے بیڈ کے قریب کھڑی تھی۔ اس نے جیسے ہی اس کی نیم وا آنکھوں کی درز میں کالی پتلی کو غائب اور سفید ڈھیلے کو باہر نکلتے دیکھا، اس کے منہ سے بدحواسی میں چیخ نکل گئی......

"ڈاکٹر تزئین، ادھر آیئے!"

اور پہلے اس کے دونوں شانے پکڑ کر اسے جھنجھوڑا پھر ایک ہاتھ سے اس کے دل کو مسلا اور ساتھ ساتھ دوسرے ہاتھ سے آکسیجن کے سلنڈر کو سنبھالا۔

تب تک ڈاکٹر تزئین اپنا چمڑے کا لبادہ اور خون آلود دستانے اتار چکی تھی اور ہاتھ دھو کر سفید براق تولیے کے ساتھ انہیں پونچھ رہی تھی، جب نرس کی دیوانی چیخ اسے سنائی دی، وہ فوراً پلٹ کر بیڈ کے پاس آئی اور اس کے اوپر جھک گئی۔ تبھی اس نے اپنی زرد بیمار آنکھیں کھول دیں۔ آنکھوں کی پلکوں پر ابھی تک آنسو اٹکے ہوئے تھے۔ کچھ دیر کے لیے اسے کچھ بھی یاد نہیں آیا کہ وہ کون ہے؟ کہاں ہے؟ اور کس حال میں ہے؟ چند ساعت سکوت رہا پھر اس کی ناک کے نتھنے پھڑکے۔ فضا میں تازہ خون کی بو تھی۔ اس کا تھکا ہوا ذہن بیدار ہو گیا۔ اسے سب کچھ یاد آگیا...... سب کچھ۔ تب اس کا دل چاہا کہ وہ جھٹکا مار کر اٹھے اور اپنی پوری قوت سے چیختی، چلاتی، فریاد کرتی باہر بھاگ جائے۔ مگر اس کا جسم تکان سے بالکل بے سکت تھا۔ دونوں بازو دائیں بائیں بے جان لوتھڑوں کی مانند پڑے تھے۔ کمزوری سے گردن ایک طرف کو ڈھلکی ہوئی تھی اور فرش پر خون آلود پاؤں کے ادھورے نشان تھے...... شاید بہت دیر ہو گئی تھی۔

"MURDERE"...... اس کے ذہن میں ایک لفظ اُبھرا، اس نے بولنا چاہا مگر اس کے ہونٹ بھنچے رہے۔

اسے یاد آیا جب وہ ساتھ والے کمرے سے اس کمرے تک آئی تھی، وہ اندر سے بہت کمزور اور مایوس تھی۔ پچھلے ایک دن سے رو رو کر اس نے خود کو بالکل نڈھال اور پسپا کر لیا تھا۔ خوف اس کے اندر بھرا ہوا تھا۔

ماں نے اسے حوصلہ بڑھانے کے لیے اپنی ٹھہری آواز میں کہا تھا۔

"میری جان گھبراؤ نہیں، حوصلہ رکھو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔" اور پھر شہادت کی انگلی اوپر اٹھاتے ہوئے کہا تھا...... "وہ ہمارے ساتھ ہے۔" اور اس کے اندر ڈانواں ڈول ہوتا ایمان پھر سے پختہ ہو گیا تھا۔ شاید یونہی ہو اور خوشی کا لمحہ وقت سے پہلے آگیا ہو...... اس نے اپنے اندر ایک ہلکی سی خوشی کو محسوس کیا تھا۔

کمرے کی فضا غیر مانوس تھی۔

دوائیوں کی بو، آکسیجن کے سلنڈر، بیڈ پر پڑی سفید چادر اور سرخ کمبل، ڈرپ اسٹینڈ، ہیٹر کی زرد روشنی، روئی، چمڑے کے لبادے...... اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے اپنا لباس تبدیل کیا اور ہسپتال کا پچھلی بندشوں والا کھلا سا لباس پہن لیا۔ اس ذرا سی تبدیلی نے کمرے کی فضا کو کچھ اور پر اسرار اور معنی خیز بنا دیا۔ وہ پھر سے کمزور پڑنے لگی۔ اس کی ہمت جواب دے رہی تھی، وہ رونا چاہتی تھی۔ یہ سب کیا ہو رہا تھا۔ کہیں نہ کہیں کوئی بھید ضرور تھا اور وہ اندھیرے میں

تھی۔ اس نے عاجزی سے ماں کی طرف دیکھا تھا۔ اس وقت اس نے محسوس کیا کہ وہ کانپ رہی تھی۔

نرس نے اسے بیڈ پر لیٹنے میں مدد دی۔ تب گھٹے دل کے ساتھ وہ رسمی طور پر مسکرائی۔ اندر سے وہ بالکل ڈھے چکی تھی۔

"ماں، میرے قریب ہی رہنا......"

"ہاں بیٹا......" ماں کی نظریں مسلسل اس پر گڑی تھیں۔ اس کا چہرہ خاموش اور گھمبیر تھا اور اس کے ہونٹ بڑے تواتر سے ہل رہے تھے۔ جب اسے ڈرپ لگی تو اس نے اوپر دیکھا۔ نرس اور ڈاکٹر کے درمیان ماں کا چہرہ نمایاں تھا۔ اس کی فکر مند آنکھیں گیلی تھیں۔ شاید اس کو بھی حوصلے کی شدید ضرورت تھی۔

"ماں، میں بالکل ٹھیک ہوں۔" اس نے بھیگے لہجے میں کہا تھا۔

ماں نے بڑی شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تھا۔

اس کے ہونٹ مسلسل ہل رہے تھے......وہ تیسرا کلمہ پڑھ رہی تھی۔

"سب ٹھیک ہے نا، ماں؟" اس نے سرگوشی میں پوچھا تھا۔ اسے کیسا وہم آرہا تھا۔ ماں نے اثبات میں سر کو ہلایا اور اس کے ریشمی پریشان بالوں کو سہلاتی رہی۔ اس کے گلے میں آنسوؤں کا پھندا تھا۔ اسے یاد آیا کہ نرس نے ماں کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر انہیں تسلی دی تھی......اس کی پریشان ٹٹولتی نظریں کبھی ماں اور کبھی ڈاکٹر کے چہرے پر ٹک جاتی تھیں۔

ماں کے ہلتے ہونٹ اس کے گرتے حوصلے کو سنبھالا دے رہے تھے۔

"BRAVO......سب کچھ ٹھیک ہے مائی ڈیئر چائلڈ۔ پریشان نہ ہو، ہمت کرو......ایسا اکثر ہو جاتا ہے۔"

ڈاکٹر وجیہہ نے خود روئی سے اس کے کندھے پر سپرٹ لگا کر انجکشن دیا تھا۔

"اب تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہو گی......"

"اچھا......" اس نے گھٹی سی آواز میں کہا تھا اور چہرے پر بشاشت لانے کی کوشش کی تھی......ایک بار پھر وہ اندر سے کمزور پڑتی جا رہی تھی۔ اس کا دل بیٹھ رہا تھا۔ جانے کیا ہونے والا تھا۔ اس نے اچانک ایک ہاتھ اپنے اوپر رکھا......وہ متحرک تھا......اس کا ہاتھ بھی لرز رہا تھا۔ اس کے پورے وجود پر خوف کی کپکپاہٹ تھی۔

کیا وہ اسے دیکھ سکے گی؟ وہ کیسا ہو گا......؟ پریشانی کے بوجھ تلے اس ہلکی پھلکی خوش آئند سوچ نے اسے تھوڑا سا سکون دے دیا۔ وہ ہلکا سا مسکرائی اور گہرا سانس لے کر ماں کی

طرف دیکھا۔ تبھی درد کی پہلی لہر اٹھی اور اس کے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔ اس نے گھبرا کر اپنا ہاتھ ماں کی طرف بڑھایا۔ ماں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں چھپا کر محبت سے اسے چوما۔

''میری بچی، میری جان۔ تم سدا سلامت رہو۔''

ماں نے دل کی گہرائی سے دعا دی تھی۔ ماں کی آنکھوں میں خوف تھا اور اس کے ہلتے ہونٹ بے جان ہو رہے تھے۔

ماں کی آنکھوں میں خوف کیوں تھا؟ وہ ماں سے ایک گہری بات پوچھنا چاہتی تھی...... اس نے بھرائی آواز میں مشکل سے کہا تھا۔

''ماں...... وہ...... میرا مطلب ہے...... وہ...... یعنی اسے کوئی خطرہ تو نہیں؟ وہ ٹھیک تو ہے نا......؟''

اس کی آواز آنسوؤں سے گھٹ گئی تھی۔ مگر تبھی نرس نے ماں کو باہر جانے کے لیے کہا...... اور اس کے سوال کا اسے جواب نہیں ملا تھا۔

اسے یاد آیا کہ درد کی یہ لہریں آہستہ آہستہ تیز ہوتی گئی تھیں۔ درد کی ان لہروں میں وہ گھری سی گئی تھی، کوئی جائے پناہ نہ تھی۔ پیٹ کے بوجھ سے اس کا دم گھٹنے لگا تھا اور وہ کرب سے تڑپنے لگی...... وہ چیخ رہی تھی۔ چیختے چیختے اس کے حواس گم ہو گئے تھے، گلا رندھ گیا تھا، زبان خشک تھی۔

اس کی چیخوں سے سارے ہسپتال میں ایک سناٹا سا پھیل گیا۔ وارڈ کے ہر مریض کے چہرے پر مردنی سی چھا گئی تھی اور ہر ہاتھ آسمان کی طرف اٹھ گیا تھا...... یہ دعا کا وقت تھا۔

اب یاد کرنے پر اسے یاد آیا کہ جب ان دلدوز چیخوں کے درمیان اسے ساتھ والے کمرے میں لایا گیا تھا تو اس کے پاؤں میں خون تھا۔

یہ کس کا خون تھا؟

وہ چیخ چیخ کر پوچھنا چاہتی تھی مگر درد کی شدت نے اس کے حواس گم کر دیے تھے۔ اس کا جسم ٹھنڈے پسینے میں بھیگا ہوا تھا اور پیٹ پتھر کی طرح بوجھل اور ساکت تھا۔ اس نے ڈرپ والے بازو کو زور سے جھٹک کر ڈرپ گرانے کی کوشش کی مگر بے سود۔ چار نرسوں نے اسے مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ بے بسی سے وہ بچوں کی طرح سسک پڑی...... بچاؤ...... مگر اس کی آواز کو کسی نے نہیں سنا۔ آنسو اس کی پلکوں پر منجمد ہو گئے اور اس کی دردناک چیخیں خلا میں ساکت ہو گئیں۔ اس کے بعد کیا ہوا، اسے کچھ یاد نہیں رہا تھا۔ درد کی شدید لہروں میں

سب کچھ گڈمڈ ہو گیا تھا۔ بس اسے اتنا یاد تھا کہ مسلسل چیخنے سے اس کا گلا بند ہو گیا تھا، اس کے ہونٹ سوکھ کر تڑخ گئے تھے اور ہونٹوں کے کونے خون سے بھرے تھے...... اس کے ماؤف ہوتے ذہن میں اگر کوئی خیال تھا تو صرف...... اس کا...... نیم غنودگی میں اس کا ہاتھ اپنے اوپر خود بخود آ گیا تھا، گویا اسے سنبھالنے اور بچانے کی کوشش میں تھی...... وہ ساکت تھا۔

تب بصیرت کی تیسری آنکھ اس کے اندر کھل گئی۔

خون...... خون...... MURDER۔

اس کی اکڑی خشک زبان سے یہ لفظ اس کے تڑخے ہونٹوں پر گرا اور بغیر سماعت کے فنا ہو گیا۔ لیکن اس کی بازگشت اب بھی...... اس وقت بھی، اس کے ذہن میں تھی اور وہ اسے سن سکتی تھی۔

"نہیں، مائی ڈیئر چائلڈ، ایسا کچھ نہیں ہوا۔"

ڈاکٹر نے اس کے اوپر جھک کر نرمی سے کہا تھا، جیسے اس نے اس کے ذہن میں اٹکے اس لفظ کو پڑھ لیا ہو۔

"وہ کچھ نہیں تھا...... اور تمہیں بچانے کے لیے ایسا کرنا بہت ضروری تھا۔" اور وہ جو، ان کے درمیان ایک روحانی اور جذباتی واسطہ تھا، وہ لمس کی زبان میں محبت کی سرگوشیاں...... وہ سب کیا تھا؟ اس نے آنسوؤں سے دھندلائی آنکھوں سے ایک تاسف کے ساتھ ڈاکٹر تزئین کی طرف دیکھا۔

اتنا بڑا جھوٹ، اتنا بڑا فراڈ۔

ڈاکٹر نے آہستہ سے نفی میں سر ہلایا۔ جیسے وہ اس کے دل کی آواز سن رہی ہو۔

وہ مایوسی اور بے اعتمادی کے ساتھ اس کی طرف دیکھتی رہی۔

نرس نے اپنا ہاتھ اس کے بے ترتیب گیلے بالوں پر پھیرا۔

"تھینک گاڈ...... تم زندہ ہو...... تم بچ گئیں...... تھینک گاڈ...... جب تم نے آخری طویل چیخ ماری تو تمہاری ماں نے سجدے میں گر کر اللہ کا شکر ادا کیا اور تمہارا صدقہ اتارا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ تم نے نجات پالی اور اس کی دعا قبول ہوئی۔"

اور میری دعا؟ وہ کیوں لوٹا دی گئی؟ وہ کیوں قبول نہ ہوئی؟

اس کے ذہن میں پھر وہی لفظ ابھرا مگر ادا نہ ہو سکا۔

"تمہیں اس وقت بالکل پرسکون رہنا چاہیے، بالکل پرسکون، بس اتنا سوچو کہ تم زندہ ہو اور یہی سب سے بڑی حقیقت ہے۔"

نرس اس کے ہونٹوں سے جما خون صاف کر رہی تھی۔
اس نے آہستہ سے نرس کے ہاتھ کو پرے ہٹادیا۔
MURDERER...... قاتل...... اس کے ذہن میں اٹکا ہوا لفظ پھر بولا مگر یہ آواز کسی نے نہیں سنی۔ اس نے اپنی دھندلائی ہوئی آنکھیں بند کرلیں۔
اب وہ کسی کو دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔
ماں کو بھی نہیں...... اس کے خلاف اس سازش میں شاید ماں بھی شامل تھی۔
اس نے آنکھیں بند کرلیں تو ڈاکٹر تزئین نے سکون کا سانس لیا...... وہ اس کا سامنا کرنے سے گھبرا رہی تھی۔
پھر اس نے چور نظروں سے سنک کی طرف دیکھا...... اس کی نظریں بے اختیار سنک کے اندر پڑی تام چینی کی چلمچی پر چلی گئیں، جس کے اندر سردیوں کی اس ٹھٹھرتی رات میں ایک ادھورا نامکمل وجود عریاں پڑا تھا۔ ○○

غزلیں

نشترؔ خانقاہی

ورثے میں جو ملا تھا، وہ تیور نہیں گیا
سب کچھ گیا میان سے خنجر نہیں گیا

کچھ قابلِ بیاں تو نہیں پر عزیز من!
یہ سال بھی گزشتہ سے بہتر نہیں گیا

اپنوں کے درمیاں بھی ہوں مہمان کی طرح
گھر جا کے بھی لگا ہے کہ میں گھر نہیں گیا

اونچی تو کی ہیں ایڑیاں پاپوش کی مگر
قد اب بھی اس کا میری برابر نہیں گیا

کیسے بچا سکوں گا میں گھر کی روایتیں
بیٹا مرا مزاج میں مجھ پر نہیں گیا

دل میرا وہ ملازم غفلت پسند ہے
تعطیل کے بنا بھی جو دفتر نہیں گیا

دیوانگی بھی، آبلہ پائی بھی، دشت بھی
میں بھی تو اس رواج سے باہر نہیں گیا

○○

کس نے سوچا تھا کہ وہ بدلے گا رویہ اتنا
شہر بدلا ہے بہت، پر نہیں بدلا اتنا

دن نکلتے ہی اُسے بھول گیا ہوں جیسے
رات آتی ہے تو میں نے اسے سوچا اتنا

دور تک مجھ میں عجب منظر پامالی ہے
اس سے پہلے تو نہ اترا تھا یہ دریا اتنا

وہ نہ سمجھا کہ سمجھنا نہیں چاہا اُس نے
ہم نے اک چہرہ اسے یاد دلایا اتنا

یوں تو ملتی نہیں دنیا کے غموں سے فرصت
پھر بھی اچھا نہیں ہوتا غم دنیا اتنا

ہم اسے جان کے جانے کہ نہیں جانتے ہیں
کس کو معلوم تھا کہ اس میں ہے کرشمہ اتنا

تم سے اک پل کی رفاقت بھی گوارا نہ ہوئی
ہم نے بیکار کیا تم پہ بھروسہ اتنا

○○

مظہر امام

اُسے حال سے باخبر کیجئے
مگر خود کو بھی معتبر کیجئے

کئی زلزلے آج آنے کو ہیں
تماشائے زیر و زبر کیجئے

حنا اب درختوں پہ اُگتی نہیں
مرے خون میں ہاتھ تر کیجئے

بہت دور تک ریت ہی ریت ہے
ذرا دعوتِ چشم تر کیجئے

کبھی تو ندامت کا احساس ہو
تقاضہ سرِ رہ گزر کیجئے

کہیں بھی اتر جایئے راہ میں
سفر کو بہت مختصر کیجئے

جدائی کے دن ہیں، غزل ہی سہی
یہی ایک کارِ ہنر کیجئے

○○

میں عکس عکس رنگِ بہاراں میں کھو گیا
یہ حادثہ عجیب ہے، ہونا تھا، ہو گیا

لمحات بے بصر کے تعاقب میں وہ گیا
خمدار سیڑھیوں کا اندھیرا تھا، کھو گیا

اب دیکھئے کہ فصل ہو کس کے نصیب میں
میں تخم خواب رات کی کھیتی میں بو گیا

میں ساحل مراد پہ تھا تیرا منتظر
لہروں کا زور دل کا سفینہ ڈبو گیا

جاگا رہا جو بستر شب پر تمام عمر
وہ کون تھا، جو آج سر صبح سو گیا

آیا تھا وہ بہار کا موسم گزارنے
اپنے لہو میں اپنا سراپا بھگو گیا

اٹھو، کہ اب تو صبح ہوئے دیر ہو گئی
وہ داستان درد سنا کر، سنو، گیا

○○

مخمور سعیدی

تری طلب ہی بتائے شاید مرا گزر اب کہاں کہاں ہے
نئی نئی سی کوئی زمیں ہے، نیا نیا سا اک آسماں ہے

یہ قربتوں کی فضا میں اک دوریوں کا احساس کیوں جواں ہے
یہ کون الگ کر رہا ہے ہم کو یہ کس کی پرچھائیں درمیاں ہے

تری جدائی میں اشک بن کر کہیں ان آنکھوں سے بہہ نہ جائے
تری محبت کہ خون بن کر مری رگوں میں رواں دواں ہے

عجب مسافر ہیں، چل پڑے ہیں بس اپنی دھن میں تو چل پڑے ہیں
نہ راستوں کا کوئی پتہ ہے نہ منزلوں کا کہیں نشاں ہے

اسی سے پوچھو کہ رنگ و بو کا وہ قافلہ کس طرف سِدھارا
ہوا، کہ گلشن کی آتی جاتی ہوئی رُتوں کی مزاجداں ہے

یہ کب سے پامال کر رہا ہے ہماری آباد بستیوں کو
عجب چھلاوا ہے غم کا سایہ، ابھی وہاں تھا ابھی یہاں ہے

ہزار قصے سنے گئے ہیں اس انجمن میں مگر یہ سچ ہے
کہی نہیں جو کسی نے مخمور ابھی اک ایسی بھی داستاں ہے

OO

نکلے تھے اک جہان کے لیے سفر پہ ہم
آخر پلٹ کے آئے خود اپنے کھنڈر پہ ہم

پیروں تلے وہاں بھی یہی ریگزار تھا
پہنچے زمیں سے چل کے جو بامِ قمر پہ ہم

شاید ہمارا کچھ بھی نہ اس خشک و تر میں تھا
کہنے کو حکمراں تو رہے بحر و بر پہ ہم

ہوتی نہ پھر ہواؤں سے اپنی یہ دوستی
رکھتے جو آشیاں کسی شاخِ شجر پہ ہم

قدموں تلے نہ روند دیں اس آسمان کو
یہ بوجھ کیوں اُٹھائے پھریں اپنے سر پہ ہم

بے اعتبار ہوتے نہ سب کی نگاہ میں
کرتے جو اعتبار خود اپنی نظر پہ ہم

مخمور اُٹھ سکے نہ دعا کو ہمارے ہاتھ
دستک تو دینے آئے تھے بابِ اثر پہ ہم

OO

(احسان جعفری مرحوم کے نام)

اے خاکِ وطن، تیرے پرستار تو سب ہیں
ہم ہی ہوئے کیوں خوار، گنہگار تو سب ہیں

ہم بھی ہیں قطاروں میں، کفن سر پہ اُٹھائے
جلدی تھی تمہیں ورنہ سرِ دار تو سب ہیں

اب دیکھیں بنے شیشۂ جاں کس کا نشانہ
پتھر لئے یوں درپئے آزار تو سب ہیں

باہر نہ دھواں ہے نہ سلگنے کی مہک ہے
اندر سے بھڑکتے ہوئے انگار تو سب ہیں

اے شہرِ اہنسا میں کھڑے ہیکل گاندھی
اب دیکھ ترے شہر میں خونخوار تو سب ہیں

حاکم بھی ہیں منصف بھی جو کہتے ہیں سرِ بزم
معصوم سہی، دشمن و غدار تو سب ہیں

''اک نوحؔ نہیں جو ہمیں کشتی میں بٹھا لے
ورنہ کسی طوفان کے آثار تو سب ہیں''

○○

دل ونظر میں سمایا ہے ایک ہی چہرہ
میرے وجود پہ چھایا ہے ایک ہی چہرہ

کچھ اس طرح مری نس نس میں وہ ہوا شامل
کہ ہر نظر نے دکھایا ہے ایک ہی چہرہ

نہیں حسیں کوئی ایسا جہان میں دوجا
خدا نے ایسا بنایا ہے ایک ہی چہرہ

لطیف سانس کی گرمی ہے ان لبوں کا لمس
جو ہر طرف نظر آیا ہے ایک ہی چہرہ

بغیر اس کے رہی زندگی اداس اپنی
کرن اُمید کی لایا ہے ایک ہی چہرہ

یہ کیسا پیار ہے اقرار ہے نہ ہی انکار
مجھے یہ پوچھنے آیا ہے ایک ہی چہرہ

○○

پروفیسر غفار بابرؔ (پاکستان)

خاک کو خاک سے اکسیر بنا دیتے ہیں
ہم کہ ہر خواب کو تعبیر بنا دیتے ہیں

اور کیا ہوگی بھلا معجزۂ فن کی نمو
'حور' کو 'جھنگ' کی ہم 'ہیر' بنا دیتے ہیں

ذرّے ذرّے پہ ستاروں کا گماں ہوتا ہے
ریت پر جب تیری تصویر بنا دیتے ہیں

اپنی پلکوں پہ جگا کر ترے خوابوں کے چراغ
ہم شبِ غم کو بھی تنویر بنا دیتے ہیں

رقص جب دار پہ کرتے ہیں ترے دیوانے
زلف کو پاؤں کی زنجیر بنا دیتے ہیں

دل کہ ہے لذتِ آزار سے واقف بابرؔ
ہر حسیں آنکھ کو ہم تیر بنا دیتے ہیں

○○

رکھنے ضرور دل میرا دلبر بھی آئے گا
لیکن وہ لے کے ہاتھ میں خنجر بھی آئے گا

ایڑی اُٹھا کے چلنے لگا ہے جو ساتھ ساتھ
کل کو یہ میرے قد کے برابر بھی آئے گا

لکھوں گا جب میں اس کا سراپا تو خودبخود
کوزے میں بند ہونے سمندر بھی آئے گا

ملنے کے واسطے مجھے کانٹوں کے شہر میں
میں نے سنا وہ رشکِ گلِ تر بھی آئے گا

اتنا وہ بے لحاظ نہیں جانتا ہوں میں
آیا ہے جب یہاں تو میرے گھر بھی آئے گا

مجھ کم سخن کی بزم میں بابرؔ خدا گواہ
سوچا نہ تھا کہ تجھ سا سخنور بھی آئے گا

○○

عارؔف شفیق (کراچی)

خلاف جبر اگر سرکشی نہیں کرتے
بجھے چراغ ہیں جو روشنی نہیں کرتے

پہنچ نہ سکتے تھے قاتل مرے ٹھکانے تک
مرے ہی لوگ اگر مخبری نہیں کرتے

میں سچ کی آگ میں جلتا ہوا وہ سورج ہوں
یہ چاند تارے مری رہبری نہیں کرتے

ثبوت مل گئے جب میری بے گناہی کے
تو کس لئے مجھے منصف بَری نہیں کرتے

یہ بات کم نہیں سقراط کے مقلد ہیں
یہ سچ ہے بات کوئی اَن کہی نہیں کرتے

بہت ہی بولتے ہیں اس صدی کے دانشور
کوئی بھی بات مگر کام کی نہیں کرتے

تمہارے سر کی بھی قیمت نہ لگتی پھر عارؔف
جو سچ کے نشے میں تم شاعری نہیں کرتے

○○

حسیں خوابوں کا منظر چاندنی میں
ذرا دیکھو سمندر چاندنی میں

یہ خواہش ہے کہ اس شعلہ بدن کو
کروں محسوس چھو کر چاندنی میں

مرا دشمن بھی تھا بے حِس بلا کا
جلایا تھا مرا گھر چاندنی میں

مرے ہمراہ تھا اک چاند چہرہ
نہایا تھا میں شب بھر چاندنی میں

دیے آنکھوں میں چاہت کے سجائے
کوئی آیا تھا چھت پر چاندنی میں

زمیں پر بھی تو ہیں کچھ چاند سورج
ملا کرتے ہیں اکثر چاندنی میں

مجھے سونے کہاں دیتے ہیں عارؔف
حسیں یادوں کے نشتر چاندنی میں

○○

شاہد کلیم

چاروں طرف ہے گھور اندھیرا جنگل میں
کھو گیا آخر رستہ میرا جنگل میں

فطرت کے اسرار کھلیں ہم پر شاید
دھونی رمائیں، ڈالیں ڈیرا جنگل میں

پتوں سے چھن چھن کے کرنیں آتی ہیں
دیکھا ہے رنگین سویرا جنگل میں

ڈھونڈو گے تو شہر میں ہی مل جائیں گے
چھپتا نہیں اب کوئی لٹیرا جنگل میں

پھیل رہی ہیں روز درختوں کی شاخیں
کوئی کیسے ڈالے گھیرا جنگل میں

صبح سویرے جانے کہاں اڑ جاتی ہیں
چڑیوں کا ہے رین بسیرا جنگل میں

شاید دریا کوئی اُبلنے والا ہے
جال لئے بیٹھا ہے مچھیرا جنگل میں

کیسے کیسے سانپ یہاں ہیں دیکھوں میں
بین بجائے کوئی سپیرا جنگل میں

جس کے نیچے چاہتا ہوں، سو جاتا ہوں
شاہد ہے ہر پیڑ گھنیرا جنگل میں

○○

تماشا کچھ دکھاتا گھے ہمیں اس تھیر پانی پر
چلیں گے ڈال کے ہم پاؤں میں زنجیر پانی پر

یہ لہریں کٹ کے پھر اک دوسرے سے مل ہی جائینگی
چلا کر کیا ملے گا آپ کو شمشیر پانی پر

سمندر کی طرف سب دیکھتے رہتے ہیں حیرت سے
چمکتی تیرتی ہے کیا کوئی تصویر پانی پر

لہو پر آدمی کے گفتگو سنتا رہا ہوں میں
سرِ محفل ذرا اب کیجئے تقریر پانی پر

چمکتے چاند کو چادر میں اپنی مت چھپا بادل!
کہ وہ پھیلا رہا ہے دلنشیں تنویر پانی پر

نہیں میں ہی نہیں پاگل، جنونی تو بھی ہے شاہد
تری تحریر بالو پر، مری تحریر پانی پر

○○

احمد صغیر صدیقی (کراچی)

(جون ایلیا کی نذر)

وہ اپنے آپ میں کچھ ڈھونڈتا نہیں ہے کیا
میں کھو گیا ہوں اسے کچھ پتا نہیں ہے کیا

مرے دُکھے ہوئے دل سے یہ کھیل کیسا ہے
کسی کے پاس کوئی مشغلہ نہیں ہے کیا

اک عاشقی ہی پہ کیا ختم ہو گیا ہے جنوں
اب اس کے بعد کوئی سلسلہ نہیں ہے کیا

میں صرف اپنی ہی آواز سن رہا ہوں یہاں
کہ شہر بھر میں کوئی بولتا نہیں ہے کیا

تو کیا غبار تمنا ہے میرے جسم پہ کم
وہ پوچھتا ہے تو کیوں، دیکھتا نہیں ہے کیا

○○

نیاز جیراج پوری

دیس میں پریوں کے پہنچے اور بچے سو گئے
رات پھر ہم قصہ کہتے کہتے تنہا ہو گئے

نیند کی خوشبو نے آنکھوں کو معطر کر دیا
ذہن میں خاکے بنا کر خواب کے ہم سو گئے

شام آئی سر پہ سورج یادوں کا پھر آ گیا
بھیڑ میں سایوں کی حال و ماضی کی ہم کھو گئے

کٹ گیا وہ پیڑ اور تعمیر اک گھر ہو گیا
جانے کتنے ہی پرندے بے ٹھکانا ہو گئے

آستینوں سے لہو جن کی ٹپکتا ہے ابھی
محوِ حیرت ہوں وہی قاتل مسیحا ہو گئے

نام پر تعمیر کے مصروف ہیں تخریب میں
ہم اسیرِ سازشِ اہلِ سیاست ہو گئے

ہجر کے اس موڑ سے ہم وصل کے اس موڑ تک
ایسا بھی اکثر ہوا ہے ڈھونڈنے خود کو گئے

چال چلتا ہے زمانہ اب قیامت کی نیازؔ
گاؤں کے حالات اور ماحول شہری ہو گئے

○○

عبد الاحد سازؔ

خوش فہمی کا جادو ٹونا، جذبوں کا جنن تھا
ہر مشکل آسان تھی مجھ پر، جب میں کمسن تھا

ربر کی ایک جھلّی پہچانیں چاٹ گئی ورنہ
میرے اور اس کے رشتے کا تعین ممکن تھا

زادِ سفر کی کیسی امانت داری کی میں نے
نقشِ قدم دیکھے تو کھلا، میں کتنا خائن تھا

منصف کی تو خیر سے وقعت ہی کیا تھی، تس پر
جو مجرم قانون کی زد میں تھا، وہ مقنّن تھا

نئی سہولت نئے تقاضوں پر فائق ٹھہری
بنے وہ شاعر، مشغلہ جن کا 'تاک دھنا دِھن' تھا

دانستہ اقدام کو کیوں کر کہیے سازؔ المیہ؟
جب ہم خود سے جدا ہوئے، تب رات نہ تھی، دن تھا!

○○

ہے کینسر اسے، تو اُسے دق ہے، اُس کو سِل
بیمار عورتوں سے لگایا کرو نہ دِل

کچھ دن نفس کی گونج، اُبلتے لہو کا شور
پھر روح کے سوال پر ششدر دماغ و دل

اک لاعلاج روگ کی لمبائی سا یہ وقت
یہ ریگزارِ جاں، یہ تماشائے آب و گِل

تپتا بخار، غرق نظر، گمشدہ سا ذہن
رہ رہ کے ایک یاد سی ہوتی ہوئی مخل

بدصورتی، غریبی، دبی خواہشیں، سماج!
سرطان بن کے رہ گیا اب بدنما سا تِل

اب حشر ہی اٹھے تو مٹے ارتقاء کی جھینپ
اپنے کئے پہ نوعِ بشر آپ ہے خجل

یہ آدمی ہے سازؔ کہ 'ٹی۔بی' کا 'ایکسرے'
چھلنی دماغ، کھوکھلا چہرہ، دریدہ دل

○○

علی افتخار جعفری (لاہور)

جنوں، قرینۂ اہلِ جہاں سے خالی رہا
برستی آگ تھی سر سائباں سے خالی رہا

تمام عمر بھٹکنے دیا نہ تو منِ فکر
یقین، حیرت و لطف گماں سے خالی رہا

ہمارا کیا کہ نظارے میں محو تھے ہم تو
ترا جہاں تھا تری ہی اماں سے خالی رہا

خبر نہیں، یہ تری کج ادائی ہے کہ مری
ترا صحیفہ مری داستاں سے خالی رہا

کہیں ملا بھی تو اک دستِ سنگِ بار ملا
جنوں نصیب، کفِ مہرباں سے خالی رہا

وہ بادباں کہ ستا و شناس ہے اب بھی
مرا سفینہ اُسی بادباں سے خالی رہا

OO

دلِ خوش خواب ہے گزرنے زمانوں میں کہ تم ہو
زرِ کم یاب ہے ان خاک دانوں میں کہ تم ہو

کوئی آواز دیتا ہے رہِ آئینہ گاں سے
محبت منتظر اگلے جہانوں میں کہ تم ہو

نکل آئے کسی قیدِ مکاں و لامکاں سے
نہیں کوئی ہم ایسے سخت جانوں میں کہ تم ہو

لئے جاتا ہے نامعلوم منزل کی طرف کون
ہُوا ہے اپنے خستہ بادبانوں میں کہ تم ہو

یہ کیا اسرار ہے یہ کون ڈھونڈے ہے کسی کو
مری آواز ہے خالی مکانوں میں کہ تم ہو

OO

ڈاکٹر نگارؔ عظیم

تمام عمر کٹی دل کا چاک سینے میں
ہزار بار مَرے اِک حیات جینے میں

ترا خیال کچھ ایسے نہاں ہے دل میں مرے
کہ جیسے رنگ سمائے کسی نگینے میں

قدم قدم پہ بہاریں پکارتی ہیں مجھے
میں شاد رہتی ہوں زہرآب غم کا پینے میں

یہ کس فضا کا تعارف ہوائیں دیتی ہیں
کہ سارا باغ شرابور ہے پسینے میں

نگارؔ کیسی شمع جل رہی ہے محفل میں
کہ لو بھڑکتی ہے ہر لمحہ میرے سینے میں

○○

دل کے فگار ہونے کا کس کو ملال ہے
آخر یہ تیز کس کا تھا اس کا سوال ہے

ہم تو قفس میں آکے بھی ہیں مطمئن بہت
صیاد کو ہی اپنے ستم پر ملال ہے

میرے دکھوں کا اس سے مداوا نہ ہو سکا
وہ چارہ گر اگرچہ بڑا باکمال ہے

غم کی بلندیوں سے اتر کر میں کیا کروں
اس کے بغیر اب میرا جینا محال ہے

میرے نگار خانہ سے پھوٹی ہے جو شفق
یہ تو کسی کے حسنِ نظر کا کمال ہے

○○

گلاب رُت نہیں ہوتا کبھی گلاب اپنا
بہت الگ ہے زمانے سے انتخاب اپنا

غزل کے شعر ہیں لیکن بہ اعتبار جنوں
بدن کے نام ہے کانٹوں کا انتخاب اپنا

بہت دنوں سے تعلق کے خواب ویراں ہیں
بہت دنوں سے گہن میں ہے ماہتاب اپنا

زمانہ بیت گیا مجھ کو آئینہ دیکھے
کہ اب نہیں کوئی منظر درون آب اپنا

مرے سوا ہے یہاں کون مجھ سے کم حیراں
میں کس کو سونپنے جاؤں یہ اضطراب اپنا

تو پھر ہو غم کے تعبیر ناشناسی کا
اگر فریب مسلسل ہو کوئی خواب اپنا

OO

آسماں یوں ہی نہیں چیں بہ چیں
ہم جو ٹھہرائے گئے رشک زمیں

ہم ہی کرتے تھے جزیروں کی تلاش
کل ہمیں ہوں گے ستاروں کے مکیں

وہی خالق ہیں ہم جہنم کے یہاں
جن کو ہے واہمۂ خلدِ بریں

اب بھی وابستۂ تحریک ہیں ہم
اب بھی ہے سرخ ارادوں پہ یقیں

داد پاتے رہے ہیں بہر کیف
خوش رہیں تجھ سے کہ ہو جائیں حزیں

ہم کہ اب تک ہیں مہاجر عاصمؔ
گو کہ دس سال سے ہیں دِلّی نشیں

OO

عالم خورشید

اک ستارہ مری طلب میں ہے
اک ستارہ بڑے غضب میں ہے

ایک صحرا ہے سامنے میرے
ایک دریا مرے عقب میں ہے

کھلنا آگیا تضادوں سے
دل مرا مستیِ طرب میں ہے

میری بنتی نہیں زمانے سے
یہ خرابی حسب نسب میں ہے

ہو گئے ہیں اسیر سب اُس کے
کوئی جادو سیاہ شب میں ہے

کیا سنے گا ہماری سرگوشی
وہ تو کھویا ہوا شغب میں ہے

زندگی سے ہوئی شناسائی
اتنی تاثیر تو ادب میں ہے

○○

راشد جمالؔ فاروقی

اک امتحان تھا سر پر گزر گیا وہ بھی
جو سیلِ کرب و بلا تھا ٹھہر گیا وہ بھی

وہی سنبھال رہا تھا جو دیر سے خود کو
لو آج ٹوٹ کے آخر بکھر گیا وہ بھی

وہ شب عجیب سا ہیجان لے کے آئی تھی
خود اپنے خون کی حدت سے ڈر گیا وہ بھی

مَرے ہوئے تو کئی لوگ اب بھی جیتے ہیں
جو جی رہا تھا حقیقت میں، مر گیا وہ بھی

اُسے بھی ہم سفری میری راس کب آئی
کہ جا رہے تھے جدھر سب، اُدھر گیا وہ بھی

نڈھال ہو گیا میں بھی عبور کرتے ہوئے
چڑھا ہوا تھا جو دریا اتر گیا وہ بھی

○○

نیاز سلطانپوری

ہر قدم پہ راہ الفت میں غم تازہ ملا
مطمئن پھر بھی ہمارے دل کا شیرازہ ملا

رات کے چہرے سے پہلے نوچئے کالی نقاب
بعدہٗ اس میں، لہو خورشید کا تازہ ملا

داستانِ حسن کی تزئین نو کے واسطے
سرخیِ خونِ وفا کا اس میں کچھ غازہ ملا

مفلسی میں پڑ گئے ہیں ماند چہروں کے نقوش
ٹمٹماتے ان چراغوں میں لہو تازہ ملا

جا رہے ہو تحفۂ دل لیکے اس بت کے حضور
لوٹ آؤ گے جو اس کا بند دروازہ ملا

زندگی کا مرحلہ یک لخت آساں ہو گیا
مونس و غم خوار جس دم غم کا آوازہ ملا

اب تو میں ہوں یا مری رسوائیاں ہیں اے نیازؔ
دل کو دنیا سے لگانے کا یہ خمیازہ ملا

OO

شارق عدیل

طلب کے ساتھ میسّر وصال بھی آئے
پھر اس کے بعد بدن پر زوال بھی آئے

سرابِ عمر میں کب سے بھٹک رہا ہوں میں
کوئی تو لمحہ سمندر مثال بھی آئے

ہم اپنے عہد گزشتہ کو پڑھ رہے ہیں ابھی
کمندیں زیرِ فلک لوگ ڈال بھی آئے

ترے خیال سے ڈھونڈوں مفر کا رستہ بھی
ترا جو ذکر کہیں ہو تو حال بھی آئے

کہ تو نے جن کو بنایا تھا پستیوں کا امیں
وہ آسمان کو تیرے کھنگال بھی آئے

جواب لکھنے میں ہم کو حجاب آنے لگا
کچھ امتحان میں ایسے سوال بھی آئے

OO

جس کی اپنے سے پہل ہو وہ سفر کیسا ہے
منتہا میں نہ نکل جاؤں یہ ڈر کیسا ہے

خواب کی دھوپ کا سورج نہیں ہوتا کوئی
پھر یہ چہروں پہ جھلنے کا اثر کیسا ہے

بند آنکھوں سے کبھی رات کو دیکھو تو ذرا
اک اُجالا وہاں مانندِ سحر کیسا ہے

اک زمانہ ہوا ہجرت کئے شہرِ دل سے
یہ کسک پھر بھی ہے باقی کہ وہ گھر کیسا ہے

ڈھونڈتا رہتا ہے خود اپنے سے اک راہِ فرار
میرے اندر جو چھپا ہے وہ بشر کیسا ہے

ہم کو مرنے کی ادا بھی نہیں آتی ہے شمیم
زندہ رہنے کا یہ لوگوں میں ہنر کیسا ہے

○○

سنگ برسانے لگا وہ شیشۂ اخلاق پر
میری آہوں کی پرت جمنے لگی آفاق پر

ہر دوا میں زہر کی تاثیر شامل ہو گئی
اب بھروسہ کیا کرے کوئی کسی تریاق پر

شکر یہ اس کا کرو سانسوں کے اتم ڈور تک
دوستو! تہمت تراشی مت کرو رزاق پر

کیوں نہیں بوڑھی حویلی کا نشاں روشن رہے
رکھ دیا میں نے چراغوں کو جلا کر طاق پر

شام کی آغوش میں اب سو گئے منظر تمام
دھند سی چھائی ہوئی ہے دیدۂ مشتاق پر

کیوں مسافر کا نہیں سامان رستے میں لٹے
مہربانی راہبر کرنے لگا قزاق پر

○○

زور چلتا نہیں پرندوں پر
اب وہ آتے نہیں درختوں پر

رُت بدلنے لگی ہے خواہش کی
اوس گرنے لگی ہے خوابوں پر

ایک دریا ہے میرے اندر بھی
میں ہی بہتا ہوں جس کی لہروں پر

میں تو کھو جاؤں گا کہیں لیکن
رنگ برسا کریں گے باغوں پر

تیز قدموں سے بھاگئے کیسے
مُردہ لمحوں کا بوجھ کاندھوں پر

پھر ہوا نے بدل لیا چہرہ
آنکھ اس کی ہے پھر چراغوں پر

خواب سب کے بکھر گئے فکریؔ
وقت ایسا پڑا ہے لوگوں پر

○○

مشورہ دل سے کیا اور کام آنکھوں سے لیا
اے سمندر! میں نے تیرا نام آنکھوں سے لیا

جسم کے شیشے میں یوں رکھی تھی جنت کی شراب
آتے جاتے موسموں نے جام آنکھوں سے لیا

کون تھا بزم طرب میں دردمندانہ شریک
اور کس نے تحفۂ گلفام آنکھوں سے لیا

میں بچھا تھا پھول کے بستر پہ کانٹوں کی طرح
میں نے ہر کروٹ پہ سود شام آنکھوں سے لیا

عمر بھر چلنا پڑا شعلوں کی چادر اوڑھ کر
بجھنے والے نے مگر انعام آنکھوں سے لیا

دن کے مرتے ہی صفِ ماتم بچھائی شام نے
رات نے آخر زوالِ شام آنکھوں سے لیا

○○

پی۔ پی۔ شریواستو رِندؔ

بات کب حد سے بڑھی، گھر میں تماشے کب ہوئے
کب منڈیریں بٹ گئیں، آنگن کے ٹکڑے کب ہوئے

رنگ الفت کے جو گہرے تھے وہ پھیکے کب ہوئے
وہ جو رشتے چہچہاتے تھے وہ گونگے کب ہوئے

اجنبی پتھر کئی سمتوں میں اچھلے تھے مگر
یہ ہمارے گھر کے چکناچور شیشے کب ہوئے

ذہن و دل میں گونجتے ہیں چند آوارہ خیال
ہم جنوں پیشہ تھے پھر آدھے ادھورے کب ہوئے

اک طلسمی خواب تھی اندھے سفر کی داستاں
کب اُجالے گھٹ گئے رستے اندھیرے کب ہوئے

مسکراتے پیڑ، ہنستے راستے، مہکی فضا
سبز موسم جو مرے اندر تھے سوکھے کب ہوئے

چاندنی راتوں میں جو اکثر چمکتے تھے کبھی
صاف ستھرے گھر کے آئینے تھے میلے کب ہوئے

رندؔ ہم تو زندگی کے زور میں پلتے رہے
جو مرے ہمزاد تھے بہرے وہ گونگے کب ہوئے

○○

اشہرؔ ہاشمی

آتی جاتی ریل دیکھتا رہا
دوریوں کے کھیل دیکھتا رہا

جھاگ ہو رہا تھا ریت میں فنا
اک عجیب میل دیکھتا رہا

زد میں آ کے اُڑ گئے طیور سب
میں لئے غلیل دیکھتا رہا

تھی بلند کس قدر فصیلِ شب
گھوم پھر کے جیل دیکھتا رہا

بام و در پہ جھومتی کسی طرح
دیکھی جو وہ بیل، دیکھتا رہا

کھیل اپنی ساری ہار جیت کا
درد کے طفیل دیکھتا رہا

○○

طوائف

اپنی فطرت کی بلندی پہ مجھے ناز ہے کب
ہاں! تری پست نگاہی سے گلہ ہے مجھ کو
تو گرا دے گی مجھے اپنی نظر سے ورنہ!
تیرے قدموں پہ تو سجدہ بھی روا ہے مجھ کو

تو نے ہر آن بدلتی ہوئی اس دنیا میں
میری پائندگیٔ غم کو تو دیکھا ہوتا!
کلیاں بیزار ہیں شبنم کے تلون سے مگر
تو نے اس دیدۂ پُرنم کو تو دیکھا ہوتا

ہائے! جلتی ہوئی حسرت یہ تری آنکھوں میں
کہیں مل جائے محبت کا سہارا تجھ کو
اپنی پستی کا بھی احساس پھر اتنا احساس
کہ نہیں میری محبت بھی گوارا تجھ کو

اور یہ زرد سے رخسار یہ اشکوں کی قطار
مجھ سے بیزار مری عرضِ وفا سے بیزار

OO

نیآز اعظمی

دو زاویے۔۲

طوائف

تم یہ کہتے ہو کہ بدنام و گنہگار ہوں میں
خود کو بازار میں نیلام کیا کرتی ہوں
کرتی رہتی ہوں جوانی کا ہر اک سے سودا
مجھ کو جو چاہے وہ ہونٹوں سے لگا لیتا ہے
اپنے ہر خواب کی تعبیر کو بیچا میں نے
پیار بکتا ہے مرا میری وفا بکتی ہے
ہونٹ بکتے ہیں مرے میری ہنسی بکتی ہے
میری انگڑائی میری چال تلک بکتی ہے

تم یہ کہتے ہو کہ بدکار و سیہ کار ہوں میں
صنف نازک کو میں بدنام کیا کرتی ہوں
لا کے بازار میں حسن و شباب بیچ دیا
میں کہ وہ جام جسے کوئی اُٹھا لیتا ہے
انتہا جسم کی جاگیر کو بیچا میں نے
چند سکوں کے عوض میری حیا بکتی ہے
قہقہے میرے مری خامشی بھی بکتی ہے
سرخی رخسار کی زلفوں کی مہک بکتی ہے

ہاتھ انسان کے انسان بکا کرتے ہیں
تم ہی بتلاؤ بھلا بات ہے کیا حیرت کی
تم نہ ہوتے جو خریدار تو بکتی کیسے
مجھ کو منظور ہے اب میرا بدن بکتا ہے
مجھ کو منظور ہے اب میں ہوں گنہگار مگر
ہو تمہیں مجھ کو گنہگار بنانے والے
تم نے ہی میری جوانی کا کیا ہے سودا
تم نے دوشیزہ ادائیں ہیں خریدی میری

کفر کے دیس میں ایمان بکا کرتے ہیں
ہے تمہیں جسم کی خواہش تو مجھے دولت کی
تم نہ ہوتے جو طلبگار تو بکتی کیسے
میری محفل میں تمہارا بھی چلن بکتا ہے
مجھ کو منظور ہے اب میں ہوں سیہ کار مگر
ہو تمہیں مجھ کو سیہ کار بنانے والے
تم نے ہی میری کہانی کا کیا ہے سودا
تم نے پاکیزہ وفائیں ہیں خریدی میری

ایک ہی ہاتھ سے تالی تو نہیں بجتی ہے
ایک ہی شخص سے محفل تو نہیں بجتی ہے
میرے ہی سر پہ ہے تنہا کوئی الزام نہیں!
میں ہوں بدنام اگر، تم بھی تو خوش نام نہیں!!

○○

نظمیں

گنتر گراس

(ترجمہ: قمر جمیل)

ہم ایک انڈے میں رہتے ہیں

ہم نے اس انڈے کے خول کی
اندرونی دیوار کو اپنے کھینچے ہوئے
گندے نقشوں اور دشمنوں کے ناموں سے
بھر دیا ہے
ہمیں کوئی پرندہ 'سے' رہا ہے
اور جو پرندہ ہمیں سے رہا ہے
وہ ضرور ہمارے قلم کو بھی سے رہا ہوگا
ایک دن انڈے سے آزاد ہو کر
ہم اس پرندے کی تصویر کھینچیں گے
وہ پرندہ بہت خوش خصلت ہوگا
ہم اس پر اسکول کے امتحانوں میں
مضمون لکھیں گے
اس پرندے کے رنگ اور اس کی نسل
کے بارے میں جو ہمیں سے رہا ہے
جانے کب اس انڈے کا خول ٹوٹے
جانے کب تک ہمارے دانشور جو اس
انڈے میں ہیں
زندگی کے سود و زیاں پر بحث کرتے رہیں گے
اور سوچتے رہیں گے کہ یہ پرندہ کب تک ان
کو سیتا رہے گا اور وہ دن کب آئے گا یہ سینا
بند ہو جائے گا
بوریت اور سچی ضرورت سے تنگ آ کر ہم
نے چوزے نکالنے کی مشین ایجاد کر لی ہے
انڈے میں جو ہماری اولاد ہونے والی ہے
ہم اس کے
بارے میں بہت فکر مند رہتے ہیں
ہمارے سروں پر ایک چھت ہے
جس پر کہن سال چوزے
اور ہفت زباں جرثومے
دن بھر بک بک کرتے رہتے ہیں
اور اپنے خوابوں پر بحث کرتے ہیں
کیا ہوا اگر کوئی پرندہ ہمیں سے نہیں رہا ہے
کیا ہوا اگر کبھی اس کا خول نہ ٹوٹے
کیا ہوا اگر ہماری تحریروں کا افق
صرف اتنا ہی ہو جتنا ہماری قلم برداشتہ
تحریروں کا ہے اور ہمیشہ اتنا ہی رہے
ہمیں امید ہے کہ کوئی ہمیں سے ضرور رہا ہے
اور اگر ہم صرف جینے کے بارے میں گفتگو ہی
کرتے رہ جائیں اور ہمارے خول کے باہر
کسی کو بھوک لگے اور وہ ہمیں توڑ کر
فرائنگ پین میں ڈال دے تھوڑے سے
نمک کے ساتھ
تو تم ہی بتاؤ انڈے کے اندر ہمارے بھائیو
ہم کیا کر سکیں گے؟

○○

پروفیسر ساجدہ زیدی

زیست کا استعارہ

جادۂ شب کے تنہا مسافر
تیرے آغاز و انجام کے درمیاں
بیکراں فاصلے اور بھی ہیں
ابھی راہ میں مرحلے اور بھی ہیں

دور تک...... بیتی گھڑیاں
جو ترے دردِ تخلیق کی رازداں ہیں
دو رویہ درختوں کی مانند
تیرے شب و روز پر نرم سایہ کئے ہیں
تیرے ہمراہ یادوں کا اک کارواں ہے

دکھ کے لمحے، مسرت کے پل
حیرتوں کی سحر کاریاں
جستجو کے کڑے کوس
نغمہ بہ لب آرزوؤں کے سرگم
ہجر کی جاوداں حسرتیں
خوش خرامی جذبات کی گزراں راحتیں
......ایک دنیائے صد رنگ
عمر رفتا کے قرطاس پر
حرف در حرف پھیلی ہوئی ہے

مگر...... یہ تو شاید
دور ماضی کے کہرے میں لپٹی ہوئی
ڈوبتی کہکشاں ہے

وقت دریائے پُر شور کی طرح
بہتا چلا جا رہا ہے......

(۲)

(آج ایک اور ہی داستاں ہے)
ارض مشرق کے دھندلے افق پر
کسی گہنائے سورج کا
بیمار سا عکس ہے
اندھیروں کے آسیب کا
راستوں میں عجب جال پھیلا ہوا ہے......

کہیں تنگ گلیوں کی نادار مخلوق
اور زندگانی کا جبر مسلسل......
کہیں ظلم و بیداد کی، داستاں ہے
کہیں انسانیت کے، سرِ عام لٹتے ہوئے
کارواں ہیں،
کہیں ماحول کے گرد لپٹا ہوا
بے حسی کا دھواں ہے
کہیں چشم پوشی کی سفاکیاں ہیں......
اشتہاری معیشت کی دلدل میں دھنستی ہوئی
شعر و نغمہ کی...... حریّت فکر کی
والہانہ زباں ہے

نغمہ و فن کی تخلیق کارِ زیاں ہے
حسن، بازارِ عصیاں میں
ہرسو، کھلے عام بکنے لگا ہے
صداقت کی ہر جستجو رائیگاں ہے
بے بسی...... رائیگانی کا کہرہ
ہر فرد کے دل پہ چھایا ہوا ہے

(۳)

ان ہی مسدود راہوں پہ
تنہا سراسیمہ و سرگرداں
تیرے افکار و اقدار کا کارواں
پابرہنہ رواں ہے

جادۂ شب کے تنہا مسافر
اپنے دل میں اتر......
تیرے سینے میں داغوں کی مشعل فروزاں ہے
دل رمزِ تخلیق کا رازداں ہے
بزمِ باطن میں احساسِ غم جاگتا ہے

اس حسین صبح کے نیلگوں آسماں پر
......ایک تنہا ستارہ لرزتا تو ہے
نیم تاریک راہوں میں
امکاں کا جگنو چمکتا تو ہے
بیکراں آسمانوں کے نیلم تلے
روشنی کے تعاقب میں

نظریں بھٹکتی تو ہیں
حسنِ فطرت کے سربستہ رازوں کے
حیرت کدے میں
جستجو رقص کرتی تو ہے
بحرِ قلزم کے آئینہ خانے میں
لعل والماس کا عکس رنگیں تو ہے

اُٹھ...... بحرِ غم کی تہوں سے اُبھر
ریگِ ساحل سے امید کی سیپیاں ڈھونڈ لا،
(قافلہ زندگی کا، بہر طور
دشتِ موجود و امکان میں
پابجولاں رواں ہے)

(۴)

تیری نظروں کے آگے...... بڑی دور تک
راستوں کے طلسمات کے
بے محابا اشارے ہیں
اک اَن سنے گیت کی نرم آہٹ ہے
شہ راہِ امکان میں
ایک موہوم سی روشنی......
جھلملا کر عجب چشمکیں کر رہی ہے

دیکھ......
اس روشنی کا تجھے کیا اشارہ ہے
شاید...... سفرِ زیست کا استعارہ ہے

خوئے سفر

میانِ وجود وعدم

تلاشِ حقیقت کا پل ہے

○○

علقمہ شبلی

مٹی

چلو اچھا ہوا، کوئی صدا بھی اب نہیں آتی

صبا بھی کوئی پیغام طرب افزا نہیں لاتی

چٹکتی ہے کلی کوئی

نہ پتّی کوئی ہلتی ہے

درِ دل پر کوئی دستک نہیں ہوتی

نہ مشرق میں

نہ مغرب میں

کہیں بھی اب نہیں جائے اماں کوئی

رہی مٹی،

مری مٹی،

متاعِ بے بہا مجھ کو

اسی مٹی کی خوشبو سے

مشامِ جاں معطر ہے

اسی مٹی کو میرے خون نے سینچا ہے

گلِ خنداں اُگایا ہے

یہی گلیاں

مری گلیاں

نشاطِ شوق کا ساماں

انہیں گلیوں میں اب بھی مرا بچپن مسکراتا ہے

ہمکتا ہے

یہیں سر پر مرے برسا کئے پتھر

مگر دیکھو

بہ ایں گردِ حوادث بھی

دمکتا ہے مرا چہرہ

یہی محسوس ہوتا ہے

مرے قدموں میں جنت ہے

○○

انوار فطرت

ہواباز

(۱)

کئی بار دیکھا ہے میں نے

جہاں اس نے پاؤں دھرا

اک ستارہ

وہاں دیر تک

جھلملایا کیا

کئی بار

اپنی ان آنکھوں سے

دیکھا ہے میں نے

کہ اک راہ کو وہ گزر بھی چکی تھی

مگر دیر تک
موج در موج ''عیطر'' میں
اُس کا سراپا
اسی راستے میں خراماں خراماں
مہکتا رہا
کئی بار ایسے بھی لمس اس کا پایا ہے میں نے
کہ جب وہ نہیں تھی

کئی بار
خود میں نے اس کو سنا ہے
کہ جب اُس نے
کچھ کہہ دیا
تو بہت دیر تک
لفظ اُسے
گنگنایا کیے

(۲)

آسماں سے اسے عشق تھا
وہ ہوا کے سمندر میں
نیلے پرندوں کو
جب تیرتے دیکھتی
اس کے پہلو سے
خوابوں میں
بھیگے ہوئے پر نکلتے
جو اس کو فضاؤں میں پھیلی ہوئی
بھید دنیاؤں میں لے اڑاتے
وہ جب تک
ہواؤں، فضاؤں، خلاؤں میں
اوپر تلے آتی جاتی
تو تب تک
میں سرکس کا بونا
اسے دیکھتا

میری حیرت
مجھے اپنا ہونا تلک بھی
بھلا ڈالتی تھی
اور اک دن
تماشا ہوا
دیکھتا ہی رہا
میں اُسے
اور وہ
پھر بھی
نیچے اتری نہیں

○○

متروکہ جائیداد

لوگ مہاجر ہو جاتے ہیں
سقف و بام وہیں رہ جاتے ہیں
فرش پہ نرمیلے قدموں کا لمس
کمرے میں ریشم سرگوشی
انگنائی میں گن گن کرتے گیت کنوارے

شرمیلی مسکانیں
شب میں جسم کے بھیگے سرگم
کھڑکی میں سے پہلے پیار کی لو
بوڑھی شفقت
رامائن کے پاٹھ
تلاوت
اور دعائیں
سب ماحول میں منڈلاتا رہ جاتا ہے
جانے والے سیماؤں کے
پار چلے جاتے ہیں
اور کوئی آجاتا ہے...... پھر
اور کوئی آجاتا ہے
ہوتے ہوتے
آنگن، چھت اور کمرے بوڑھے ہو جاتے ہیں
اینٹیں مٹی ہو جاتی ہیں
کاٹھ میں دیمک لگ جاتی ہے
آخر اک دن
ملبے کی بے ڈھنگی ڈھیری رہ جاتی ہے
وہ بھی
اچھے داموں بک جاتی ہے
دور
چلے جانے والے بھی
مٹی ہو جاتے ہیں...... لیکن
آوازوں، مسکانوں
گیتوں اور دعاؤں کو
شفقت اور محبت کو
کوئی دیمک کھا نہیں پاتی...... ان کو
مٹی بھی ہونا نہیں آتا......
ہجرت بھی نہیں کرنی آتی

OO

احمد صغیر صدیقی (کراچی)

آنکھیں، کان اور دل

لگی ہوئی ہیں
سوچتی آنکھیں
اک مبہم اندازے پر

لگے ہوئے ہیں
کان مسلسل
دور کسی آوازے پر
کھڑی ہوئی ہے
دل بے رنگی
ست رنگے دروازے پر

OO

پہلی بار

رات کے اندر اتر کر
میں نے پہلی بار دیکھا
حسن کیا ہے روشنی کا
میں نے پہلی بار چکھا

ذائقہ تشنہ لبی کا
نیلگوں دریا کنارے
ایک چلّو ریت پی کر

OO

شیریں احمد

شاید

آج
میں نے
پہلی بار
اور طرح سے
آئینہ دیکھا
اور کئی سوال
خود سے پوچھے
آئینے میں مجھے
صرف ایک صورت دکھائی دی
ایک لڑکی کی،
آئینہ
اندر کے رنگ
نہیں دکھا پاتا
شاید
اس نے بھی مجھے
آئینے ہی سے
دیکھا ہوگا

OO

انتظار

میں
سمندر کے کنارے بیٹھی ہوں
کئی لہریں آکر
میرے پیروں کو
ریت سے بھر جاتی ہیں
یہ ریت
لہروں کے وجود کا
احساس دلاتی ہے
اور یادوں کی طرح
میرے پیروں پر
اکٹھی ہو جاتی ہے

OO

حفیظ آتش

خودکشی

تم اپنے شہر کی تصویر دیکھو
اور پہچانو
کہاں تم ہو
کہاں وہ لوگ ہیں جن کے لئے تم نے
زمینوں کی تہیں کھودیں
اُگائے پھول اور پودے
تم اپنے شہر کی تصویر دیکھو
اور پہچانو
گھنے پیڑوں کے سائے میں

بہت سے گھونسلے تھے
اُن پرندوں کے
جنہوں نے قطرہ قطرہ
آرزوؤں کو نچوڑا
خوشبوؤں کو جسم میں ڈھالا
سلگتی آندھیوں کو
وار سے پہلے یہ سب منظر
برستی روشنی میں
غسل کرتے تھے
......گلی کوچوں میں
......بو پھیلی ہوئی ہے
سڑتی لاشوں کی
ہر اک منظر لہو کے دائروں میں
گھومتا ہے
دھویں کی آستینوں سے
چھپی نفرت نکل کر
جھومتی ہے
ہواؤں میں اچھلتے خنجروں کی
نوک پہ رکھا ہوا شہر
نہ جانے تنگ آکر
کس طرح یہ خودکشی کر لے

○○

دروازہ

شہر کے بھاری دروازے پر
کیا لکھا ہے
لوگ اُسے پڑھتے ہیں
پڑھ کر ہنس دیتے ہیں
ہنستے ہنستے دن کی سیڑھی
چڑھ جاتے ہیں
پھر راتوں کو
قبرستانوں میں جا کر
سناٹوں کے
ورق ورق الٹا کرتے ہیں
روتے روتے
شاہوں کے ناموں سے پہلے
جبر کے انہونے قصوں کو
دہراتے ہیں
بینائی کہ ہر رستے میں
دروازہ ہے
کون بتائے
دروازوں پر
کیا لکھا ہے

○○

فریب در فریب

وہ ایک مدت کے بعد مجھ سے
ملی تو میں نے
کہا کہ اب تک جوان ہو تم
یہ میں نے مانا
تمہارے اور میرے درمیاں اب
نہ جانے کتنے ہی فاصلے ہیں

مگر میری چاہتوں کا مرکز
وہی ہے، اب بھی
میں چاہتا ہوں تمہاری قربت
یہ فاصلوں کی دبیز دیوار
توڑ دے تو
میں جی سکوں گا
وگرنہ یہ سانسیں
اس پڑاؤ پہ رک گئیں تو
تمہاری گردن پہ
اس کا آخر عذاب ہوگا
مجھے یقین ہے
تمہارے دل میں
کہیں ذرا سی کسک تو ہوگی
اگر کسک ہے ذرا بھی زندہ
تو آؤ ان موسموں کو دونوں
ہم اپنی بانہوں میں بھر کر چھولیں
کہ لذتوں کے گگن کو چھولیں
نہ جانے تم میں
یہ کون بیٹھا ہوا ہے جس نے
کہا ہے مجھ سے

کہ میں حفاظت ہوں دوسرے کی
یہ لذتوں کا
گناہ مجھ سے نہ ہو سکے گا!

○○

خوف

نہ جانے کون سی مٹی بدن میں ہے
جو درد آ کے ٹھہرتا ہے نمو پاتا ہے
کوئی بھی لمحہ خوشی کا ہو
روٹھ جاتا ہے
بہت سے دائرے بنتے ہیں
ٹوٹ جاتے ہیں
بدن میں پھیلنے لگتی ہیں
تپتی دوپہریں
حسین شام کے منظر
پگھلنے لگتے ہیں

تمہاری یادوں کے
سائے میں جلنے لگتے ہیں
طلوع ہوتا ہے
موسم کہیں سے پت جھڑ کا
تو شہر دل میں بھی
ویرانیاں بکھرتی ہیں
اُداسیاں میری
خاموشیوں سے ڈرتی ہیں

○○

نجات

یہ کس نے آخر
چراغ سارے بجھا دئے ہیں

اندھیرا اپنے تمام آسیب
لے کے سورج کی سمت اپنے
پروں کو پھیلا رہا ہے کب سے
کوئی تو دیکھو
سارے منظروں کو نگل نہ جائے
ہماری آنکھوں کی روشنی
مستعارِ شب ہے

اگر یہ سورج طلوع نہ ہوگا
تو آسمانوں میں
بارہ برجوں کے سب ستارے
ہمارے حق میں
نہ جانے کیا فیصلہ کریں گے
نجومی اپنے سیاہ کاغذ پہ کیا لکھے گا
ہواؤں کا رُخ بدل چکا ہے
پرانی کشتی کے بادبانوں کو
رسّیوں سے نجات دے دو

○○

بلقیس ظفیر الحسن

ٹی۔وی دیکھتے دیکھتے

جیسے تیز نکیلے ہو کر دانت مچل اُٹھتے ہیں
منہ سے باہر آجانے کو
ناخن بن جانے لگتے ہیں..... خونی پنجے
سینگ نکل آنے کو سر میں کھٹکنے لگتی ہے!
بیحد خوفزدہ ہو کر میں جائزہ اپنا لینے لگ جاتی ہوں
لمبے لمبے گھنے بالوں کا جسم پہ اگنا ڈھونڈوں
ٹی۔وی پر گجرات کی خبریں دیکھتے دیکھتے
یہ مجھ کو کیا ہو جاتا ہے
ارے کوئی ہے......؟
کوئی تو مجھ انسان کو آدم خور درندے کے قالب میں
ڈھل جانے سے بچالے......!!

(۲)

خبریں دیکھتے دیکھتے اک دم اٹھ پڑتی ہوں
دوڑ کے کھڑکی سے لگ جاؤں
سانسیں روک کے باہر سے آنے والی
ہر آہٹ کی سن گن لوں
دل ہی دل میں دل کو تھامے گنتی رہوں میں
آس پاس کے اپنے نام سے ملتے جلتے ناموں والے
گھر والوں کو
کس کو پتا کل صبح کی نیوز میں میرے نام کے ساتھ
ان کا بھی نام آجائے
گھر کو آگ لگا کر مار دیئے جانے والے
لوگوں میں
اب یہ میری سمجھ میں آیا ہے کہ
نام میں کیا رکھا ہے

(۳)

بے حد خوفزدہ ہوں اور حیران ہوں اسے بھی زیادہ
مان لیا، جو کچھ بھی ہوا وہ ایک منظم سازش ہے
مان لیا عیاری ہے یہ سب فاشسٹ سیاست کی
لیکن آخر ہم کیوں ان کے ہاتھوں
تانڈو ناچ رہے ہیں
ہم کوئی کٹھ پتلی ہیں کیا؟؟

(۴)

دبائے جانے پہ کاٹ لینا تو ایک فطری عمل ہے
اب تلملائے پیروں سے چیونٹیاں مل کچل کے
ماری بھی جائیں تو کیا؟؟

OO

سلیم انصاری

میرے ہونے میں تم روشن ہو

تم سے مل کر
میں خود میں واپس آتا ہوں
تم سے مل کر
میری سوچیں
نظموں کی صورت میں روشن ہو جاتی ہیں
تم نے میری تنہائی کو
ایک نیا آکار دیا ہے
تم نے میری خاموشی کو
آوازوں کا ایک نیا سنسار دیا ہے
تم نے میرے خوابوں کو تعبیر عطا کی
تم نے میرے جذبوں کو تائید عطا کی
تم نے میرے لہجے کو توقیر عطا کی
تم نے میری نظموں کو معنی بخشے ہیں
تم ہی میری نظموں کے تخلیقی عمل کے
ہر موسم میں شامل ہو
لیکن......تم کو یہ بھی علم نہیں ہے شاید
تم سے میرے ہونے کی خواہش روشن ہے
میرے پیارے
کھو مت جانا
ورنہ نظمیں لکھنے کی سرشاری سے محرومی کا
کرب کہاں تک سہہ پاؤں گا
آخر اک دن
اپنی ہی سوچوں کے ہاتھوں مر جاؤں گا

OO

یہ وقت کیا ہے

یہ وقت کیا ہے
کہ اپنے معمول سے گریزاں ہر ایک شے
ہے
ہر اک لمحہ
گزشتہ لمحات کی نفی ہے
عجیب وہم و یقین کا امتزاج

سوچوں میں گھل گیا ہے
جو خواب دیکھو تو زندگی پر یقین آئے
دیے بجھا دو تو روشنی پر یقین آئے

سراب...... دریا ہے
اور ریگِ رواں سمندر
بدن پہ زخموں کا جال ہے
جگنوؤں سے لکھی ہوئی عبارت
یقین...... وہم و گمان کی حد
شکستگی...... امتحان کی حد
یہ وقت کیا ہے
کہ اپنے معمول سے گریزاں ہر ایک شئے ہے

○○

رفیق سندیلوی ﴿پاکستان﴾

برادہ اڑ رہا ہے

ترمرے سے ناچتے ہیں
دیدۂ نمناک میں
بّراق سائے رینگتے ہیں
راہداری میں
برادہ اُڑ رہا ہے
ناک کے نتھنے میں
نلکی آکسیجن کی لگی ہے
گوشہ لب رال سے لتھڑا ہے
ہچکی سی بندھی ہے

اک غشی ہے
میرا حاضر میرے غائب سے جدا ہے
کیا بتاؤں ماجرا کیا ہے
زمانوں قبل ہم دونوں کا رستہ
● پوٹلی میں ماں کے ہاتھوں کا پکا کھانا
کتابیں اور بستہ ایک تھا
کڑیوں کے رخنوں میں
ہمارے ساتھ چڑیاں رات دن
بسرام کرتی تھیں
ہماری مشترک چہکار تھی
درزی سے کپڑے ایک جیسے سل کے آتے تھے
ایک سے جوتے پہنتے
بوندا باندی میں اکٹھے ہی نہاتے
ہم جدھر جاتے ہمیشہ ساتھ جاتے
رات جب ڈھلتی
تو سنتے تھے کہانی
صحن میں رکھے ہوئے مٹکے کا پانی
پیڑ کی چھاؤں
ستاروں سے مزین آسماں
ہانڈی کی خوشبو
اور وریدوں کا لہو
المختصر خوابوں کی دنیا ایک تھی
اک دوسرے کا حاضر و غائب تھے
ہم جڑواں تھے
اعضاء اور عناصر میں دوئی ناپید تھی

سینے سے سینہ
دل سے دل
ماتھے سے ماتھا منسلک تھا
کیا بتاؤں
کس طرح بجلی لپک کر تال سے نکلی
کنارے اپنا دریا چھوڑ کر رخصت ہوئے
تکلے کا دھاگا کس طرح ٹوٹا
سرہانے خواب جو رکھے تھے، کب بدلے گئے
زینہ کدھر کو مڑ گیا
وہ کونسا سامان تھا
جس کے پھینکنے پر
دل تو راضی تھا
مگر جس کے اُٹھانے سے کمر دکھتی نہ تھی
کس درد کی پرچھائیں تھی
جو شئے و مظہر سے نکلنا چاہتی تھی
دھند جو دیوار کے دونوں طرف تھی
اس کا قصہ کیا سناؤں
الغرض اب کیا بتاؤں
وقت نے جب تختۂ آہن پہ رکھ کر
تیز رو آری چلائی تھی
ہمیں ٹکڑوں میں کاٹا تھا
اُسی دن سے برادہ اُڑ رہا ہے
پیڑ کے سوکھے تنے سے
چھت کی کڑیوں سے
کتابوں اور خوابوں سے
برادہ اُڑ رہا ہے
میرا حاضر میرے غائب سے جدا ہے!

OO

یامین ⟨پاکستان⟩

پچھل پیری

دوپہر سنسان تھی
آم کے اک پیڑ کے نیچے
مچلتی لڑکیاں
خواب جن کے
ایسے خالی برتنوں کی طرح بجتے تھے
کہ جو تانبے کے ہوں
اور دھوپ میں یوں دور سے چمکیں
کہ جیسے بجلیاں
ایک جس کی آنکھ
کچے آم کی اک پھانک تھی
اپنے دل کی بات
جو اک رات میں لپٹی ہوئی تھی
کھولنے بیٹھی
کلیجہ کانپ اُٹھا
"وہ مجھے
ندی کے نیلے پانیوں پر
دھوپ کی مانند پھیلے دیکھ کر

یوں ہنس پڑا تھا
جیسے اس کی قبر پر
ہنستے ہیں آج
دودھیا نرگس کے پھول
ایک دن کے زوج میں
اور عمر بھر کے روگ میں
لپٹی ہوئی
میں تھی
اور بستر کا وہ کونا
تیز نیزے کی طرح چبھتا رہا
سخت باتیں
بند کمرے میں برہنہ بددعاؤں کی طرح
جلنے لگیں
آنگنوں کی گود بھریاں
میرے چھدرے سائے سے
ڈرنے لگیں
رفتہ رفتہ جسم کے اندر
ہزاروں تتلیاں
جلنے لگیں
اور پھر ایک رات
آنکھیں پھٹ پڑیں
اور جسم دُہرا ہو گیا
پاؤں میرے......"

○○

کشور ناہید

زبان پہ رکھی مرچ

کبھی کبھی رات عمر میں مجھ سے بڑی ہو جاتی ہے
میری دوست بن کر ساتھ بیٹھ جاتی ہے
میرے بستر میں سلوٹیں ڈالتی ہے
میری ہتھیلی پہ نامانوس سرسراہٹ جگاتی ہے
اور میرے ہاتھ میں قلم پکڑا کر پھر
غائب ہو جاتی ہے
میں کورے کاغذ سے رشتہ باندھنے کی جستجو میں
اپنی ہتھیلی پہ ٹھہری نامانوس سرسراہٹ کو
وجود دینے کے لئے
میز کی دوسری جانب ایک اور
کرسی لا کر رکھتی ہوں
خالی کرسی پہ رات پھر آ کر بیٹھ جاتی ہے
قہقہہ مار کر ہنستی ہے
اب بولنے بھی لگتی ہے
تم عورتیں بھی ایک اور شخص کے بغیر خود کو
نامکمل سمجھتی ہو
وہ شخص لکڑی کا ہو کہ پتھر کا
تم اسے قریب دیکھنے کے لئے ساری عمر گنوا دیتی ہو
تم اس کے لئے سنورتی ہو، کھانے پکاتی ہو
اس کے لئے اپنا نام تک قربان کر دیتی ہو
اب رات پھر غائب ہو جاتی ہے

رات کی ہر بات کو فراموش کرنے کے لئے
میں اب سونے کے لئے لیٹ جاتی ہوں
اندھیرے کمرے میں لگی تصویروں کی
تصویر بنانے لگتی ہوں
دروازے تک جانے کے راستے کو نظر میں
بھرتی ہوں
تکیے کے نیچے ہاتھ لے جاتی ہوں
میرے پکڑنے سے پہلے رات وہ سکہ اُٹھا کر
ہوا میں اچھالتی ہے
''دیکھا! جیت میری ہوئی!!''
یہ کہہ کر ہنستی ہوئی باہر چلی جاتی ہے
اس وقت باہر سے اخبار والے کی آواز آتی ہے
اخبار میں اس مرد کی تصویر ہے
جو کبھی اس گھر میں آتا تھا
مجھے رات کی جیت یاد آتی ہے
میں ہنستی ہوئی کچن میں
چائے بنانے چلی جاتی ہوں

OO

A Poem on Equator

کیا تمہیں واقعی وہ وقت یاد ہے
جب ہم نے ترک تعلق کا فیصلہ کیا تھا
شاید اس وقت جب دنیا نے اپنا سفر ختم کیا تھا
یا شاید اس وقت جب دنیا نے اپنا سفر
شروع نہیں کیا تھا
مگر یہ تو دونوں ایک ہی طرح کے سوالات ہیں
مجھے یاد پڑتا ہے ہم نے ایک سایہ دار
جزیرے میں ٹھہر کر
چاند کی گرمی میں بنا کوئی حرف کہے
یہ عہد کیا تھا کہ جب تک ہڈیاں زمین میں مل کر
مٹی نہ ہو جائیں
ہم نہ صرف دوست رہیں گے
بلکہ دوستوں کے بھی دوست رہیں گے
مگر وعدہ تو وعدہ ہوتا ہے
کسی بھی صنوبر کے سائے کی طرح غیر معین
یہ وعدہ کسی بادشاہت کا عہد نامہ تو نہیں تھا
آنکھوں سے اچانک آنسوؤں کا بہہ جانا
نہ رفاقت کے مٹنے کا نوحہ ہوتا ہے
نہ ایک دوسرے کو دیکھنے کے باوجود
غیریت برقرار رکھنے کا
بنا حرف کہے کوئی عہد نامہ

تو پھر یہ ترک تعلقات کا لمحہ کب آیا
کہ ان فراق لمحوں میں بھی تنہائی کی طلب
اس طرح ہے جیسے ہم بدنی کے دنوں کی لذتیں
اکیلے میں بھی مسکراہٹیں عطا کرتی تھیں
فراق زمانے کی یہی سرمئی دوسراہٹ
اور بات کرنے کی پیاس کا مٹ جانا
شاید ترک تعلقات کے فیصلے کا لمحہ
یہی تھا

OO

عذرا عباس

نظم

سدا بہار کچھ بھی نہیں ہے
بس ہیں تو
ہماری مجبوریاں
ان پر بہار رہتی ہے
یہ ہر موسم میں
ہماری زندگی کی کیاریوں میں
کھلتی رہتی ہیں
اکثر چاندنی راتوں میں
تاکتی ہیں
سفیدے کے پھولوں پر جم کر
بارشوں میں یہ
آسمانی بجلی بن کر
ہمارے سروں پر منڈلاتی ہیں
کبھی کبھی یہ جھینگر کی آواز بن کر
ہماری نیندوں میں گھس آتی ہیں
اور ہمیں جاگنے دیتی ہیں
ہم ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے
ہم انہیں کچھ نہیں کہہ سکتے
ہم انہیں اپنے پاؤں سے کچل بھی نہیں سکتے
اور نہ انہیں کیڑے مار دواؤں سے بھگا سکتے ہیں
ہم جانتے ہیں جب ہم نہیں رہیں گے
تو بھی یہ رہیں گی
ہماری مجبوریاں
تب یہ ہمارے ناموں کے ساتھ
یاد کی جائیں گی

○○

ایک دوسرے

ہم دونوں اکٹھے رہتے ہیں
اکٹھے سوتے ہیں
ہمارے دکھ سکھ ایک ہیں
ہماری آنکھیں ایک دوسرے کے خواب
دیکھ لیتی ہیں
ہم کہیں بھی ہوں
ایک دوسرے کے ناموں سے
جانے جاتے ہیں
ہمارے گھر آنے والے
اپنی دستک میں
دونوں کا نام شامل کرتے ہیں
دن کے پہلے حصے میں
کھلنے والی ہماری آنکھیں
ایک دوسرے کو خوش آمدید کہہ دیتی ہیں
اب لفظ ہمارے درمیان چپ رہتے ہیں
ہماری سانسوں کا آہنگ
جسم کی حرکت سے
ایک دوسرے کے ہونے کا اطمینان دلاتا ہے
ہم اب اکثر ایک دوسرے کی نیند سو لیتے ہیں

لیکن اس کے باوجود
اکثر گہری راتوں میں
ہمارے دل
اپنے اپنے سینوں میں
الگ الگ دھڑکتے ہوئے
سنائی دیتے ہیں۔

○○

Sparrow

ذرا سی بھی اونچی اڑتی
تو بچ جاتی
گاڑی کے پہیوں سے
کچلی نہ جاتی
وہ تو ہمیشہ اونچی ہی اڑتی رہی
آج پہلی بار
شوخی میں آئی
اور چلتی ہوئی بھیڑ میں
اِدھر سے اُدھر ہوگئی
گردن ایک کونے میں
لٹکی ہوئی
اور دھڑ
ایک پہیئے نے پیس کر رکھ دیا
اونچی اڑتی تو شاید
اپنی موت آپ مرتی
ایک کبوتر نے دیکھا
تو سر جھکا کر کہا

"اتنی چھوٹی موت
کسی کے نصیبوں میں نہ ہو
جو یہ اونچی اڑانوں میں رہتی
تو اس کے لئے
کوئی شکرا
اوپر سے نیچے تو آتا!!"

○○

مصطفی ارباب

گردش

اپنے کرخت چہروں کے ساتھ
ہمارے گھروں میں
گھس آتے ہیں،
اُن کی آمد
ہمیں رینگتی ہوئی
چیونٹیوں میں تبدیل کردیتی ہے
وہ ہمیں تلاش کرتے ہیں
ہمارے گھر کا
کونا کونا چھان ڈالتے ہیں
اس بات سے بے خبر
کہ ہم
ان کے گلے میں لپٹے
اسکارف پر
مسلسل گردش کررہے ہیں

○○

ویتنام میں امریکی سپاہی

لڑ رہے ہیں ہم بے دل و بے جاں سے
تھک گئے ہیں
میدان جنگ میں کھڑے کھڑے
اونگھتے ہیں بندوقوں کا سہارا لے کر
ٹھٹھر رہے ہیں کھائیوں میں پڑے پڑے
ایسا ہی کوریا میں ہوا تھا
ایسا ہی ہو رہا ہے ویتنام میں

جوں جوں گرتے ہیں بم
ہوتا ہے دھماکہ
اُٹھتا ہے دھواں
جوں جوں دہاڑتی ہیں توپیں
اور بہتا ہے خونِ انساں
وہ خون چاہے دشمن کا ہے
امریکی نیگرو یا گورے سپاہی کا ہے
جوں جوں میدان جنگ میں
آگے بڑھتے
یا پیچھے ہٹتے ہیں ہم
اپنے گھر، اپنے وطن کی یاد آتی ہے

لڑ رہے ہیں ہم بے دل و بے جاں سے
آٹھ برسوں سے لگاتار
میدانوں، میں دلدلوں میں
جنگلوں میں، گھاٹیوں میں
پہاڑوں کی وادیوں میں
اپنے وطن سے دور
اپنے پیاروں سے دور
سر پر باندھے کفن
ہم ہیں اپنے ملک
اپنی قوم کی بربریت کی تصویر
گناہ گار ہیں اپنی ہی نظر میں ہم

لڑ رہے ہیں بے دل و بے جاں سے
اور جانتے ہیں
اے ویت نام کے بہادر سپاہیو!
جیت آخر میں تمہاری ہوگی
سینچا ہے تم نے اپنے ہی خوں سے
اس خاکِ وطن کو

مگر اے دوستو!
معاف رکھنا
وطن ہمیں بھی پیارا ہے
تمہاری جیت میں ہماری ہار نہیں
تمہاری جیت ہماری بھی جیت ہوگی
حق کی جیت ہوگی امن کی جیت ہوگی
اور لوٹ جائیں گے اپنے وطن کو ہم
ہزاروں ساتھیوں کی یادیں لے کر
جن کا خوں بھی اس زمیں کی نذر ہوا ہے

OO

انیس امروہوی

ایک سوال

تم نے شاید،
رُسوائی کے ڈر سے
سارے تحفے لوٹائے ہیں
خط بھی سارے بھجوائے ہیں
واپس............لیکن
وہ جو میری روح، تمہارے
تن من میں رقصندہ ہے
تمہاری ہستی میں جی رہی ہے
وہ میری سانسیں
جو تمہارے
سینے کی دھڑکنوں میں
دھڑک رہی ہیں
کیسے لوٹا پاؤ گی......؟
مرجاؤ گی
تب بھی کیسے
رُسوائی سے بچ پاؤ گی......؟

OO

شکوہ

میرے خدا......!
یہ میری دعائیں
بے اثر کیوں
ہو رہی ہیں؟
ترے کرم کی
تمام بارش
وہ تیری رحمت
عنایتیں سب
اغیار کی جھولی
میں جا رہی ہیں
میں جیسے لشکر میں
غنیم کے گھِر گیا ہوں
میرے خدا......!
کیوں میری دعائیں
بے اثر ہو رہی ہیں؟

OO

مجبوری

میں جب بھی
سڑک پار کرنے کی
کوشش کرتا ہوں
تبھی
سامنے ترا ہے پر
بتّی
لال ہو جاتی ہے

OO

تجزیہ

خورشید اکرم

"واپسی سے پہلے" کی کہانیاں اور کہانی کار

"واپسی سے پہلے" صغیر رحمانی کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے، جس میں اُنیس کہانیاں ہیں۔ یہ کہانیاں پچھلے دس بارہ برسوں میں اردو کے چھوٹے بڑے رسائل میں شائع ہو چکی ہیں۔ تاہم صغیر رحمانی کا نام اردو کے سنجیدہ قارئین اور ناقدین کے درمیان اس طرح نمایاں نہیں ہوا جس طرح ان کے ساتھ یا بعد کے لکھنے والے دو ایک پوچ اور ذہنی بیمار کہانی کاروں کے نام فی الوقت تذکرے میں ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا صغیر رحمانی نے کوئی ایسا قابل ذکر افسانہ لکھا ہے جو سنجیدہ قارئین کو اپنی طرف متوجہ کر سکے؟ جواب تلاش کرنے کے لئے کتاب کے صفحے پلٹنا شروع کیجئے۔ دیباچہ زبیر رضوی نے لکھا ہے جن کے پرچے 'ذہن جدید' میں صغیر رحمانی کی کم از کم چار کہانیاں شائع ہوئی ہیں۔ اس کے بعد ڈاکٹر محمد حسن کا ایک چھوٹا سا اقتباس درج ہے جو انہوں نے 'عصری ادب' شمارہ ۶۸ کے اداریے میں لکھا تھا۔ ملاحظہ ہو...... "اس بار ہمارا دامن نایاب تحفوں۔ سے بھرا ہے۔ خاص طور پر افسانے ایسے...... کہ اس سے قبل شاید ہی عصری ادب کو میسر آئے ہوں۔ ان میں بھی سب سے زیادہ نمایاں ہے 'واپسی سے پہلے'۔ کسی طرح یقین نہیں آتا کہ روس کی زندگی کے بارے میں ہی نہیں، وہاں کی عالمگیر معنویت رکھنے والے حالات پر ایسا بھرپور افسانہ ہندوستان میں لکھا جا سکتا ہے۔ کیسا تازہ، کیسا خیال افروز!"

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

جن لوگوں نے یہ کہانی پڑھی ہے، ان میں سے بیشتر اس خیال سے متفق ہوں گے۔ اس کے باوجود یہ کہانی اردو میں مقبول نہیں ہو سکی۔ حیف! زیادہ افسوس یہ دیکھ کر ہوتا ہے کہ اس عرصے میں کئی ایسی کہانیوں کو انتخاب و اعزاز کے ذریعے مقبول بنا دیا گیا جو فکری اعتبار سے اوسط اور فنی اعتبار سے ناقص کہی جا سکتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ 'واپسی سے پہلے' کے علاوہ اس مجموعے میں کم از کم پانچ اور کہانیاں...... 'شاہزادے کی پریم کہانی'، 'مونا'، 'ایک اور وہ'، 'مجھے بوڑھا ہونے سے بچاؤ' اور 'جبھی کی آدھی شلوار' ایسی کہانیاں ہیں، جن کے بارے میں "کیسا

تازہ، کیسا خیال افروز'' جیسے توصیفی کلمات بلاخوف تردید کہے جاسکتے ہیں۔ مجموعے کی باقی تیرہ کہانیوں کے بارے میں باتیں بعد میں۔ پہلے متذکرہ بالا کہانیوں میں ایک دلچسپ مماثلت کا ذکر ہو جائے۔ 'واپسی سے پہلے' اور 'مونا' کے مرکزی کردار اور مکانی پس منظر بالترتیب روس اور فرانس کے ہیں، یعنی ہمارے لئے کافی حد تک اجنبی۔ کتابوں اور میڈیا کے ذریعے حاصل معلومات کی بنیاد پر ایک یکسر مختلف دنیا کے کوائف اور کرداروں کو بنیاد بنا کر کہانی لکھ دینا کسی معجزے سے کم نہیں ہے۔ لیکن کہانی بھی ایسی کہ ''کسی طرح یقین نہیں آتا''۔ نرمل ورما کی کہانی 'ڈیڑھ انچ اوپر' ایک ایسی عورت کی کہانی ہے جس کو گستاپو پولیس حکومتِ وقت کے خلاف خفیہ بغاوت کے الزام میں پکڑ کر لے گئی ہے اور اس کا شوہر شراب خانہ میں بیٹھا اپنی بیوی کے بارے میں سوچ رہا ہے جسے اب تک اس کی خفیہ سرگرمیوں کا کچھ علم ہی نہیں تھا۔ 'آجکل' میں جب یہ کہانی شائع ہوئی تو پروفیسر ساجدہ زیدی نے لکھا تھا کہ تیس پینتیس برس پہلے انہوں نے یہ کہانی کسی انگریزی کے مصنف کے نام پر پڑھی تھی۔ ان کا حافظہ اس سے زیادہ ساتھ نہ دے سکا۔ نرمل ورما ہندی کہانی کا بڑا نام ہے۔ 'ڈیڑھ انچ اوپر' ان کی مشہور زمانہ کہانی ہے، اور وہ کافی دنوں تک چیکوسلواکیہ میں رہ چکے ہیں۔ صغیر رحمانی ایک چھوٹے سے شہر آراہ میں ۱۹۶۹ء میں پیدا ہوئے۔ وہیں پلے بڑھے، درمیان میں کچھ برس تک کلکتہ میں رہے۔ 'شاہزادے کی پریم کہانی'، 'ایک اور وہ' اور 'مجھے بوڑھا ہونے دو' میں کسی جغرافیائی خطے کی نشاندہی نہیں کی جاسکتی۔ تاہم ان کہانیوں کے مکانی پس منظر کو غور سے دیکھا جائے تو لگتا ہے کہ یہ ترقی یافتہ مغربی معاشرے کی کہانیاں ہیں۔ ان کہانیوں کا بیانیہ کمال ذہانت اور ایسی چابکدستی سے تراشا گیا ہے کہ بظاہر واقعاتاً پس منظر کسی بھی جغرافیائی سرحد سے ماورا نظر آتا ہے۔ کہانی کے باطن میں زمان و مکاں کی وہ آفاقی سطح نظر آتی ہے جسے آپ سرحدوں اور مملکتوں میں محدود نہیں کر سکتے۔ بس ایک حد تک کرداروں کی نفسیات اور معاشرتی پس منظر اس بات کا اشارہ کرتے ہیں کہ یہ کہانیاں ایک ایسے شہری کلچر کی زائیدہ ہین جو مغرب سے مشرق تک وسیع یا محدود پیمانے پر ہر ملک میں مل جائے گا۔ مثال کے طور پر مردیکس ورکر، مثال کے طور پر بڑھاپا اور تنہائی۔ اردو کے ایک نقاد نے افسانے کا قد چھوٹا کر دکھانے کی کوشش میں لکھا تھا کہ افسانہ زمان و مکاں سے آزاد نہیں ہوسکتا۔ اس مفروضے کی رد میں پورے شدومد سے کہا گیا کہ افسانے کو زمان و مکاں سے آزاد ہونا بھی نہیں چاہئے کیوں کہ وہی اس کا حسن، وہی اس کا جواز ہے۔ دنیا بھر کا بہترین فکشن اس خیال کی تائید میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ لیکن کمال ہے کہ یہ کہانیاں زمان و مکاں سے تقریباً آزاد ہیں، پھر بھی صنفِ افسانہ

کے فکری اور فنی حسن سے معمور۔ پھر بھی ان افسانوں پر کسی کی نگاہ نہیں ٹھہرتی۔ کیوں؟ آخر کیوں؟
جبھی کی آدھی شلوار' اسی مجموعے کی ایک اور یادگار کہانی ہے۔ فوجی بوٹوں کے تشدد اور ہمیشہ پیاسی رہ جانے والی شہوانیت (Sexual Perversion) یعنی نفسانی بے راہ روی کی غیر معمولی کہانی ہے۔ جس کی شروعات تب ہوئی تھی جب ''...... پاکستان کی کوکھ سے کٹ کر بنگلہ دیش نکل رہا تھا۔ یہیں کرچ پہننے والے آئے تھے سب ٹھیک کرنے ...... میری اور جبھی کی اور اس کی شلوار کی حفاظت کرنے ...... کیا ٹھیک ہوا تھا سب ...... میری آنکھوں کے سامنے ہی وہ سب تماشہ ہوا تھا ...... جبھی کی ملائم، ریشمی شلوار نے بھک سے آگ پکڑ لی تھی ......'' یہ مختصر سی کہانی ایجاز و اختصار کا نمونہ ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ یہ کہانی بھی کسی فلیپ نگار، کسی دیباچہ نگار، کسی نقاد، کسی ماہر فن کی نظر سے نہیں گزری۔

اس مجموعے کی باقی کہانیاں اوپر بیان کی گئی چھ کہانیوں سے رنگ روپ، چتر چرتر سب میں بالکل الگ ہیں۔ ایک چھوٹا سا قصباتی شہر، وہاں کی زندگی، وہاں کے لوگوں کے سکھ دکھ کو درشاتی ہوئی یہ کہانیاں ہیں جو بلا کسی کوشش کے خود ہی حافظے سے محو ہو جاتی ہیں۔ ان کہانیوں میں کوئی گہرا سیاسی یا سماجی شعور نظر نہیں آتا۔ ان میں شاید ہی کہیں معاشرے کے مسائل یا اپنے سماج کی نفسیات کا کوئی گہرا مشاہدہ نظر آتا ہے۔ ایسے میں ایک سوال چبھتا ہے۔
ایک شخص جس ماحول اور معاشرے میں عمر گزارتا ہے اس کی کہانیاں تو معمولی یا بالکل اوسط درجے کی ہو سکتی ہیں۔ اس کے برعکس وہ معاشرہ جو اس نے ڈھنگ سے دیکھا بھی نہ ہو، اس ترقی یافتہ Ultra Urban معاشرے کے حالات اور کرداروں کی نفسیات کی عکاسی میں کمال ذکاوت اور بیانیہ میں غیر معمولی فنکارانہ قدرت کا مظاہرہ کرے ...... یہ بات کچھ ہضم نہیں ہوئی۔

یہاں صغیر رحمانی کے بارے میں دو اور باتوں کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے۔
۱...... ان کا ایک ناول ہندی میں چھپ چکا ہے اور ایک ناول اردو میں زیر طبع ہے۔
۲...... ان کی پہلی کہانی ۱۹۸۷ء میں ''خاتون مشرق'' میں شائع ہوئی تھی۔ جن چھ کہانیوں کا خصوصی ذکر اوپر کیا گیا وہ ۱۹۹۳ء سے ۱۹۹۵ء کے درمیان لگ بھگ تین سال کے عرصے میں چھپیں۔ خاتون مشرق میں چھپی وہ کہانی اس مجموعے میں شامل ہوتی تو پڑھنے والوں کو افسانہ نگار کے فکری اور فنی شعور کے ارتقاء بلکہ الفا کا کچھ اتہ پتہ چلتا۔
کہانی کی فہم رکھنے والوں اور طرفداروں، دونوں کے لئے یہ افسانوی مجموعہ اور اس کا خالق ایک چیلنج بن کر کھڑے ہیں۔ حکم۔

OO

فالنامہ

تجسس انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ جو بات اس سے پوشیدہ رکھی جاتی ہے، وہ اس کو ہی جاننے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ انسان کی اسی فطرت کی وجہ سے بہت سی ایجادات ہوئیں اور بہت سے نظریات قائم کئے گئے۔ قدرت نے انسان کے مستقبل کے حالات اس سے پوشیدہ رکھے ہیں۔ کسی فرد کا آنے والا کل کیسا ہوگا، یا مستقبل میں اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے، اسے پتہ نہیں۔ اسی لئے وہ آنے والے کل کے بارے میں جاننے کے لئے بے چین رہتا ہے۔ آنے والے کل کے بارے میں جاننے کی یہ خواہش اُسے نہ جانے کہاں کہاں لئے پھرتی ہے۔ کبھی کسی نجومی کے دروازے پر، کبھی کسی بابا کے پاس اور کبھی وہ فٹ پاتھ پر بیٹھ کر طوطے سے اپنے مستقبل کے بارے میں جاننے کی کوشش کرتا ہے۔ حالانکہ جن لوگوں کے پاس وہ جاتا ہے، ان کو اپنے ہی مستقبل کے حالات معلوم نہیں ہوتے، اور وہ دوسروں کے حالات بتا کر اپنی جیبیں بھرتے ہیں اور روزی روٹی کا انتظام کر لیتے ہیں۔ انسان کا یہ تجسس اس کے خود کے لئے مفید ہو یا نہ ہو، ایسے لاکھوں لوگوں کے لئے تو مفید ہو ہی جاتا ہے۔ کچھ لوگ اپنے آپ مختلف طریقوں سے فال نکال لیتے ہیں اور اس طرح اپنے دل کی تسلی کر لیتے ہیں۔
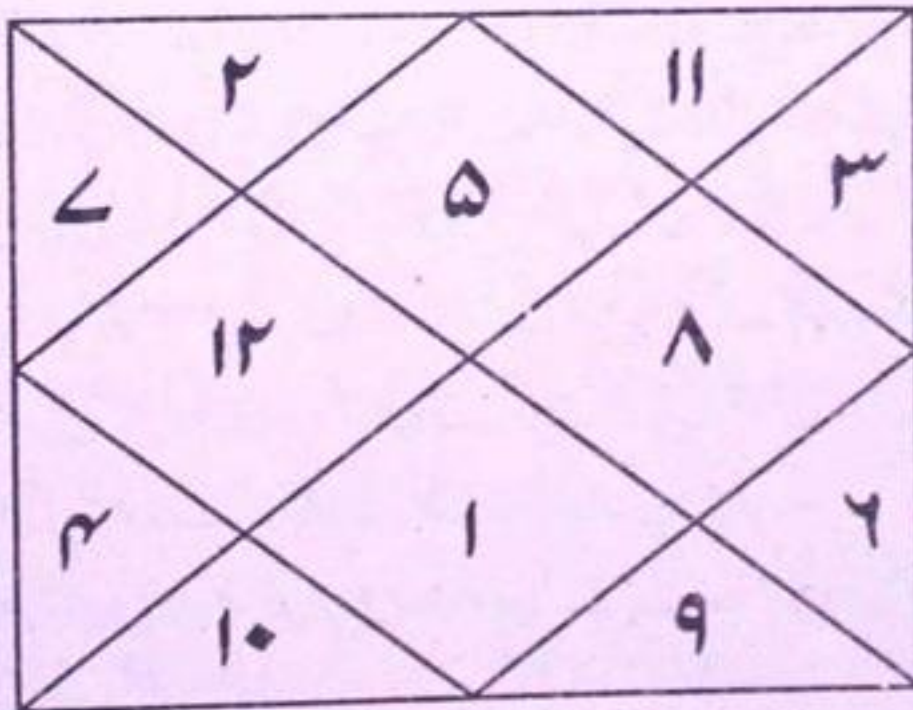
ہم نے ایسے لوگوں کے لئے نفسیات کے اصولوں کی مدد سے ایک فالنامہ مرتب کیا ہے اور ہمارا دعویٰ ہے کہ یہ کبھی غلط ثابت نہیں ہوگا۔ اگر آپ کو بھی اپنے مستقبل کا حال معلوم کرنا ہے تو اس فالنامہ سے فال لے سکتے ہیں۔ سامنے دیئے گئے زائچہ نما نقشہ پر اپنی انگلی یا پینسل آنکھیں بند کر کے کسی خانے پر رکھ دیجئے، اور پھر جس نمبر پر انگلی یا پینسل رکھی ہے، اس نمبر کے تحت دیئے گئے حالات پڑھ لیجئے۔ شرط یہ ہے کہ ایک فرد صرف ایک بار ہی اس کا استعمال کرے اور صرف اسی نمبر کے تحت دیئے گئے حالات کا مطالعہ کرے، جس پر انگلی یا پینسل رکھی ہے۔

ا۔..... جن لوگوں کے دن تکلیف سے گزرے ہیں، وہ اب یہ امید کر سکتے ہیں کہ خوش وخرم زندگی ان کے دروازے پر آگئی ہے، جس کا آپ کو عرصہ سے انتظار تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتیں جو آپ نظر انداز کر سکتے ہیں، وہی آپ کو پریشان کرتی رہتی ہیں اور آپ بار بار ذہنی تناؤ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ درگزر کی عادت ڈالئے، وسوسوں کو پاس نہ آنے دیجئے، تناؤ سے اپنے آپ کو آزاد رکھنے کی کوشش کیجئے۔ آپ کے ستارے بتا رہے ہیں کہ آپ کے اندر ایسی صلاحیتیں پوشیدہ ہیں جو زندگی کے ہر قدم پر آپ کے لئے مفید ثابت ہو سکتی ہیں، لیکن اب تک آپ ان کو پہچان نہ سکے۔ اپنی کمزوریوں کے بجائے اپنی صلاحیتوں کو ذہن میں رکھیے، ناامیدی سے بچتے رہیے، ہمت اور حوصلہ کے ساتھ ہر موڑ پر حالات کا سامنا کیجیے۔ آپ کی ایک دیرینہ خواہش، جو آپ کو پریشان کئے رہتی ہے، اس کو پورا کرنے کے لئے آپ کو قدم اٹھانا پڑے گا۔ محض سوچتے رہنے سے کام نہیں بنے گا۔ پہلے اس پر غور کیجئے، اگر ممکنات میں سے ہے تو منصوبہ بنا کر اپنے مقصد کو حاصل کرنے کی کوشش شروع کر دیجئے۔ اگر آپ خود محسوس کرتے ہیں کہ ناممکنات میں سے ہے تو اس کو فراموش کر دیجئے۔ اپنی توانائی کو ضائع کرنا مناسب نہیں۔ غصہ اور طیش سے بچنے کی کوشش کیجئے۔ اس سے کچھ نقصانات ہو سکتے ہیں۔ خاص طور پر اگر بچوں پر بغیر کسی معقول وجہ کے غصہ کیا جائے تو اس کے غلط اثرات ہو سکتے ہیں، جو دیرپا بھی ثابت ہو سکتے ہیں۔

۲۔..... آپ حوصلہ مند اور باہمت شخص ہیں۔ لیکن کبھی کبھی جذباتی ردعمل کا مظاہرہ کر بیٹھتے ہیں اور پھر پچھتاتے ہیں۔ شاید آپ گھریلو پریشانیوں کا شکار ہیں۔ لیکن ان کی وجہ سے بالکل حراساں ہونے کی ضرورت نہیں۔ اگر آپ اس مہینہ حکمت عملی سے کام لیں تو بگڑے کام بن جانے کی امید کی جاسکتی ہے۔ پریشانیوں سے پریشان ہونے کے بجائے ان پر غور کیجیے، ان کا تجزیہ کیجئے اور ان کو دور کرنے کے لئے اقدامات کیجئے۔ ضرورت پڑنے پر اپنے قریبی اور ہمدرد دوستوں سے مشورہ کیجئے۔ کیوں کہ آپ آزادی سے اپنے بارے میں سوچنے سے

ڈرتے ہیں۔ آپ دوسروں کے لئے ہمدردی کا جذبہ رکھتے ہیں، ان کے کام آنے کی کوشش کرتے ہیں، اس لئے آپ کے پاس ہمدرد دوستوں کی کمی نہیں۔ ایک بار ان کو آزما کر تو دیکھئے۔ آپ جس کو اپنا مخالف سمجھتے ہیں، وہ خود بھی اپنی پریشانیوں میں مبتلا ہے۔ اس کے پاس اتنا وقت کہاں جو وہ آپ کے بارے میں سوچے اور اپنا وقت ضائع کرے۔ منفی خیالات اور احساسات سے اپنے آپ کو دور رکھئے۔ اگر آپ خاتون ہیں تو بچوں کی نگہداشت کی طرف زیادہ توجہ دیجئے۔ شوہر کے دُکھ درد بانٹنے کی کوشش کیجئے۔ گھر میں اگر کسی سے رنجش ہے تو اسے ختم کیجئے۔ اس کا احساس جب تک ذہن پر حاوی رہے گا، کوئی تخلیقی کام نہیں ہو سکتا۔ کبھی آپ نے غور کیا ہے کہ آپ کو ایسا محسوس ہوا ہو کہ آپ کے اندر ایک فنکار پوشیدہ ہے اور وہ آپ کی توجہ کا طالب ہے اور مناسب موقع کا منتظر ہے، تاکہ اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کر سکے۔ اپنا جائزہ لیا کیجئے اور اپنی صلاحیتوں کو ڈھونڈ نکال لینے کی کوشش کیجئے۔

۳۔...... آپ سوچتے ہیں کہ آپ کی کامیابی سے آپ کے کچھ مخالفین جل رہے ہیں اور وہ آپ کو نقصان پہنچانے کے درپے ہیں۔ آپ کا یہ خدشہ صحیح نہیں ہے۔ آج کے زمانے میں ہر فرد کے اپنے مسائل اتنے ہیں کہ ان سے نمٹنے کے لئے اس کے پاس وقت ہی نہیں ہے۔ پھر وہ دوسروں کے مسائل اپنے سر لے کر اپنے آپ کو پریشان کیوں کرے؟ یہ خیال دل سے نکال دیجئے۔ آپ کو یہ بھی شک ہے کہ آپ کسی خطرناک بیماری کا شکار ہیں، یا آپ پر کسی نے کچھ کرا دیا ہے۔ یہ خیال دل سے نکال دیجئے۔ بیماری کا شک ہے تو کسی ڈاکٹر سے رجوع کیجئے اور اس کے مشوروں پر عمل کیجئے۔ اپنی شخصیت کو نکھارنے کی کوشش کرتے رہئے۔ آپ جن لوگوں کو اچھا سمجھتے ہیں یا جن کی شخصیت میں آپ کشش محسوس کرتے ہیں، ان کا جائزہ لیجئے اور ان کی ہردلعزیزی کی وجوہات معلوم کر کے آپ بھی انہیں اپنانے کی کوشش کیجئے۔ آپ باہمت اور حوصلہ مند ہیں۔ یہی خوبیاں اپنے بچوں میں پیدا کرنے کی کوشش کیجئے۔ اپنے چھوٹوں سے اچھا برتاؤ کیجئے، ان کی چھوٹی موٹی غلطیوں کا ردعمل ایسا ہو کہ ان کو خود اپنی غلطیوں کا احساس ہو جائے۔ حقیقت پسندی کو اپنا شعار بنا لیجئے، حق کا ہمیشہ ساتھ دیجئے، باطل کو شکست دینے کے لئے یہ بہت ضروری ہے۔ اونچے اونچے منصوبے بنانا اچھی بات ہے۔ لیکن ان کے لئے راہیں ہموار کرنا بھی ضروری ہے۔

۴۔...... اپنے ارادوں کو اپنے حالات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کیجئے۔ اونچی اڑان اچھی بات ہے، اگر گرنے کا ڈر نہ ہو۔ اپنی خواہشات کو اپنے وسائل کے ساتھ لے کر چلئے۔ آپ کے گھر میں خوشیوں کے آثار ہیں۔ اگر آپ ملازم ہیں تو ترقی بھی ہو سکتی ہے۔ آپ کے

گھر میں کوئی بیمار ہے اور اس کی وجہ سے اگر پریشان ہیں تو ہمت سے کام لیجئے۔ اس طرح آپ کو مغموم دیکھ کر مریض پر اس کی بیماری کا زیادہ اثر ہوگا۔ اپنے دوستوں پر بھروسہ کیجئے، ان کے خلوص کی قدر کیجئے اور خود بھی اپنے دوستوں سے محبت اور وابستگی کا اظہار کرتے رہئے۔ بچوں کو آپ کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔ دنیا کے مسائل میں مصروف رہ کر آپ گھر کی طرف سے بے توجہی نہ برتیں۔ آپ جن کو اپنا ہمدرد سمجھتے ہیں، ان کے ساتھ کچھ وقت ضرور گزاریے اور خوشگوار لمحات کا تجزیہ کیجئے۔ اگر آپ خاتون ہیں تو شوہر کی ہمدردی کی قدر کیجئے اور یہ بھی خیال رکھئے کہ وہ ہر قدم پر آپ کو اپنا ہمنوا سمجھے۔ اپنے شوہر کے مزاج کو سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ معاشی پریشانیاں وقتی ہوتی ہیں، ان پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ پریشانیوں کو اپنے اوپر حاوی نہ ہونے دیجئے۔ دوستوں کی قدر کیجئے، رشتہ داروں اور احباب سے خلوص و محبت سے پیش آیئے۔ آپ کو پُرخلوص اور ہمدرد دوستوں کی سخت ضرورت ہے۔

۵۔ ......آپ کے کسی عزیز یا دوست کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے جس کی وجہ سے آپ پریشان ہیں۔ اس کو صحیح علاج اور مناسب تیمارداری کی ضرورت ہے۔ آپ پریشان نہ ہوں، گھبرا کر اور حراساں ہو کر اپنی توانائی کو ضائع نہ کیجئے۔ اوسان خطا ہو جاتے ہیں تو سوچنے کی صلاحیت بھی کم ہو جاتی ہے اور صحیح فیصلہ پر پہنچنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اگر کچھ لوگ آپ کو انتہا پسند کہتے ہیں تو اپنے آپ کا جائزہ لیجئے کہ کیا آپ چھوٹی سی بات کو بڑا سمجھ کر اس کا اثر لیتے ہیں؟ یعنی چڑیا کے شکار کے لئے توپ کا استعمال کرتے ہیں؟ ہر مسئلہ پر غور کیجئے، جلد بازی میں کوئی فیصلہ نہ کیجئے۔ شریک حیات کے اعتماد کو قائم رکھنے کی کوشش کرتے رہئے۔ اپنے اہم فیصلوں میں ان سے مشورہ لیجئے۔ چھوٹی چھوٹی گھریلو باتوں سے تناؤ میں نہ آجایئے۔ کوئی بھی بوجھ جب دو کندھوں میں بٹ جاتا ہے تو ہلکا ہو جاتا ہے۔ اپنے عزائم کو بلند رکھئے اور ان کو پورا کرنے کے لئے اپنے ہی اندر سے توانائی جٹایئے۔ منفی سوچ سے پرہیز کیجئے، محرومی کے احساس کو دور کیجئے، ہر کام کی شروعات پُرامید رہ کر کیجئے۔ آپ نے لوگوں کو زمانے کی شکایت کرتے سنا ہوگا، ایسے لوگ اپنی حالت سے مطمئن نہیں ہوتے اور وہ زمانے کی شکایت کرتے ہیں۔ ان کی ذہنی پریشانیوں کی وجہ بھی یہی بے اطمینانی ہوتی ہے۔ اپنا محاسبہ تو کر کے دیکھئے۔

۶۔ ......آپ منصوبے بہت بناتے ہیں یا ان پر عمل بھی کرتے ہیں۔ اگر آپ عمل شروع کر دیں تو اپنے مقاصد میں ضرور کامیاب ہوں گے۔ آپ کے منصوبوں کی تکمیل میں کونسی روکاوٹیں ہیں؟ ان کا تجزیہ کیجئے اور پہلے ان کو دور کرنے کی کوشش کیجئے۔ جو لوگ آپ کی مخالفت پر اتر آئے ہیں، ان سے مصالحت کی کوشش کیجئے۔ آج کل مخالف جتنے کم ہوں، اچھا

ہے۔ اپنے تناؤ کو کم کرنے کی کوشش کیجئے۔ کبھی کبھی اپنے ذہن کو تفکرات سے خالی رکھنے کا احساس کیجئے۔ سب کچھ بھول کر مراقبہ جیسی کیفیت کا تجربہ کیجئے۔ خالق مطلق کی طرف دھیان لگانے سے یہ کیفیت پیدا ہو سکتی ہے۔ اپنے چھوٹوں سے اچھا برتاؤ کیجئے، ان کی چھوٹی چھوٹی غلطیوں کو ان کی اصلاح کرنے کے لئے استعمال کیجئے۔ اپنے بچوں کی خواہشات کا جائزہ لیتے رہیے۔ ان کو اگر آسانی سے پورا کر سکتے ہیں تو ضرور کیجئے۔ اس طرح وہ آسودگی حاصل کریں گے۔ رنجش کو بڑھنے نہ دیجئے، اس کو فوراً ختم کرنے کی کوشش کیجئے۔ نفرت کے درخت کو پروان چڑھنے سے پہلے ہی جڑ سے اکھاڑ پھینکئے۔

وسوسے آپ کی توانائی کو ضائع کر دیتے ہیں اور خدشات آپ کی ترقی کے دشمن ہیں۔ ناکامی کے احساس کو قریب نہ آنے دیجئے۔ پہلی کوشش میں ناکامی آپ کو کامیابی کی طرف لے جانے میں مزید توانائی فراہم کرتی ہے۔ وہ آپ کو موقع دیتی ہے کہ ناکامی کی وجوہات کو تلاش کرکے ان کو دور کرنے کی کوشش کی جائے۔

۷۔......آپ زندگی کے بارے میں ترقی پسندانہ رویہ رکھتے ہیں اور اپنی زندگی میں کچھ کر گزرنے کے مقصد کو لے کر جینے کے قائل ہیں۔ قوت ارادی کو ہمیشہ مضبوط رکھئے۔ جب کوئی کام اپنے ہاتھ میں لیں تو اس کو مکمل ہونے تک اپنی توجہ اس پر رکھئے۔ آپ خوش قسمت ہیں کہ آپ کو ہمدرد اور پرخلوص دوست ملے ہیں۔ ان کی قدر کیجئے اور ان کی محبت اور خلوص کا جواب بھی محبت اور خلوص سے دیجئے۔ ایسے دوست قدرت کا ایک عطیہ ہوتے ہیں۔ بچوں کی پرورش پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اپنی پریشانیوں میں پھنس کر ان کی طرف سے لاپرواہ ہونا مناسب نہیں۔ چھوٹی عمر میں ہی ان کی شخصیت کی تعمیر شروع ہو جاتی ہے، اور اس عمر کے تجربات اور احساسات زندگی بھر ان کے ساتھ رہتے ہیں۔ بچے اگر صحت مند ہوں گے تو ان کی شخصیت پر اچھے اثرات چھوڑیں گے۔ آپ کے گھر والوں کا بھی آپ پر کچھ حق ہے، کچھ وقت نکال کر ان کے ساتھ بھی گزاریئے اور پھر زندگی کے کچھ خوش گوار لمحات کا تجربہ کیجئے۔ خواتین کو گھر میں خوشگوار ماحول پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ عنقریب ایک خوشی کا موقع آرہا ہے۔ معاشی پریشانیاں حکمت عملی سے دور کی جاسکتی ہیں۔

۸۔......آپ کے دل میں دوسروں کے لئے ہمدردی کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ اپنے احباب میں ایک امتیازی شان رکھتے ہیں اور آپ کی ہر دلعزیزی کا بھی یہی راز ہے۔ آپ کی شخصیت کو لوگ پسند کرتے ہیں۔ اس لئے ذاتی معاملات میں آپ کا مستقبل دوسروں کی نسبت زیادہ روشن ہے۔ آپ اگر ملازم ہیں تو آپ کے ساتھ کام کرنے والے بھی

آپ کی قدر کرتے ہیں، اور حاکم و ماتحت دونوں ہی خوش رہتے ہیں۔ اپنی صحت کا خیال رکھئے۔ کبھی کبھی چھوٹی موٹی بیماریاں اگر نظر انداز کر دی جائیں تو بڑھ کر خطرناک ثابت ہو سکتی ہیں۔ اگر آپ خود یا گھر کا کوئی فرد کسی بیماری میں مبتلا ہے تو اس کو جلد ہی شفا ہو گی۔ باقاعدگی سے علاج کریں اور معالج کی ہدایت پر عمل کریں۔ یاد رکھئے، آدھا مرض دواؤں سے دور ہوتا ہے تو آدھا مرض خود مریض کی سوچ سے ختم ہوتا ہے، جب وہ سوچتا ہے کہ اس کو صحت ہو رہی ہے۔ یاد رکھئے...... پریشانی کی عمر مختصر ہوتی ہے لیکن پریشانی کے اثرات جو ذہن پر رہ جاتے ہیں، وہ دیرپا ہوتے ہیں۔ پریشانی کے احساس کو اپنے اوپر حاوی نہ ہونے دیں۔ اپنے گھر کی طرف توجہ دیجئے۔ اگر آپ خاتون ہیں تو خوش ہو جایئے۔ آپ کی تمنا پوری ہونے کے آثار ہیں۔ آپ کے خوابوں کی اچھی تعبیر ملے گی۔ منفی خیالات سے پرہیز کیجئے۔ یاد رکھیے...... ایک ہوشیار اور خانہ دار خاتون آنے والی نسلوں کی اصلاح کر سکتی ہے۔ اپنی تعلیم کا استعمال کیجئے اور اولاد کو بھی سلیقہ سکھایئے۔

۹۔...... آپ کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ آپ دوسروں کے ساتھ زندگی گزارنے میں خوش ہوتے ہیں اور علیحدگی پسند لوگ آپ کو اچھے نہیں لگتے۔ پرانی یادیں آپ کو پریشان کئے رہتی ہیں اور پھر آپ ماضی میں چلا جانا چاہتے ہیں۔ اگر آپ تجارت پیشہ ہیں تو کوئی کاروباری پریشانی ہے یا گھریلو معاملات میں کچھ بگاڑ ہے۔ کاروبار میں اتار چڑھاؤ، نفع نقصان لازمی جزو ہیں اور ہر کاروباری شخص کو ان کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ گھریلو معاملات میں بدمزگی کو جلد ختم کر دینا چاہئے۔ تلخی اگر مختصر ہو تو اس کا زیادہ اثر نہیں ہوتا۔ لیکن اگر اس کو طول دے دیا جائے تو اس کے اثرات بھی دیرپا ہوتے ہیں۔ آپ صرف اپنے بارے میں سوچنا بند کر دیں، اپنی سوچ میں دوسروں کو بھی شامل کر لیں۔ ان کے جذبات اور احساسات کو بھی سمجھنے کی کوشش کریں۔ آپ تخلیقی صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ لیکن ان کو بروئے کار نہیں لاتے۔ اپنے آپ کو پہچاننے کی کوشش کیجئے۔ اپنی خوابیدہ صلاحیتوں کو جگانے کی ضرورت ہے۔ کیا آپ محسوس کرتے ہیں کہ کبھی سستی اور کاہلی کا آپ پر غلبہ رہتا ہے اور آپ نے اسی کمزوری کی وجہ سے کئی مواقع گنوا دئے ہیں؟ جب کوئی موقع سامنے آئے تو آگے بڑھ کر اس کو دبوچنے کی کوشش کیجئے۔ اگر آپ خاتون ہیں تو گھریلو معاملات کو سلجھانے میں آپ زیادہ اہم کردار ادا کر سکتی ہیں۔ اپنی عادات کا تجزیہ تو کر کے دیکھئے! کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی عادت آپ کی ترقی میں رکاوٹ بن رہی ہو!

۱۰۔...... آپ اس وقت احساس تنہائی میں مبتلا ہیں یا اپنے کسی عزیز یا دوست کے بچھڑ

جانے کا صدمہ لئے ہوئے ہیں۔ آپ کا یہ احساس تنہائی ایک اضطراب اور کرب کی کیفیت پیدا کر سکتا ہے۔ ماضی کی تلخیوں کو فراموش کر دیجئے، حال کی خوشگوار زندگی سے لطف اندوز ہوا کیجئے۔ کسی بھی خرچ سے پہلے سوچیں کہ کیا یہ اس وقت ضروری ہے؟ اور اگر یہ خرچ کیا گیا تو دوسری ضروری مدوں میں کٹوتی کرنے کی ضرورت تو پیش نہیں آئے گی؟ بیماری کا مقابلہ ہمت اور حوصلہ سے کیجئے۔ آج کل میڈیکل سائنس نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ کوئی بیماری لاعلاج نہیں رہی ہے۔ اپنے معالج پر بھروسہ کیجئے اور اس سے تعاون کیجئے۔ اگر آپ خاتون ہیں تو آپ جس خوف کا شکار ہیں، وہ حقیقی نہیں ہے، اس کو دل سے نکال دیجئے۔ خدشات کو بھی دل میں جگہ نہ دیجئے۔ آپ کے دل میں اگر کسی شخص کے بارے میں منفی جذبات ہیں تو انہیں دور کر دیجئے۔ ناامید ہونے کی ضرورت نہیں۔ آپ کی تمنائیں جلد پوری ہوں گی۔ بچوں کی طرف دھیان دیجئے۔ ان کی تعلیم و تربیت میں اس وقت آپ کی توجہ کی سخت ضرورت ہے۔ آپ ان کے امور میں دلچسپی دکھائیں گے تو ان کی ہمت افزائی ہوگی۔ دوستوں میں سے اگر کوئی بیمار ہے تو اس کی عیادت کو ضرور جایئے اور اس کی ہمت بندھایئے۔

۱۱۔...... آپ نفاست پسند ہیں اور ہر کام نہایت عمدگی اور سلیقہ سے انجام دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ بہت اچھی بات ہے۔ لیکن آپ یہ کیوں سمجھتے ہیں کہ ساری دنیا آپ جیسی ہو جائے۔ بچوں کو اپنی راہ پر چلانے کے لئے پہلے ان کی انگلی پکڑ کر چلانا سکھایئے، ان کے ساتھ کچھ محنت کیجئے۔ آپ دوسروں کے جذبات و احساسات کا بھی خیال رکھیں۔ صرف اپنے ہی بارے میں نہ سوچیں۔ معاشی پریشانیوں کی وجہ آمدنی اور خرچ میں عدم مطابقت ہے۔ جتنی چادر ہو، اتنے ہی پیر پھیلایئے۔ اگر آپ اپنی آمدنی میں اضافہ نہیں کر سکتے تو اخراجات پر تو کنٹرول کر سکتے ہیں۔ خوش مزاجی کو اپنا شعار بنالیں۔ لوگوں سے گرمجوشی سے ملیں، تاکہ ان کو لگے کہ آپ ان سے مل کر خوش ہوئے۔ کبھی آپ نے اپنے اندر جھانک کر دیکھا ہے؟ ہو سکتا ہے آپ میں کچھ فنی صلاحیتیں ہوں جو مناسب تحریک کی منتظر ہوں۔ آپ ان صلاحیتوں کو ڈھونڈ نکالئے اور ان کو پروان چڑھایئے۔ یاد رکھیے...... دنیا کی ہر چیز تغیر پذیر ہے۔ یہاں کسی کو ثبات نہیں۔ آپ کے حالات بھی بدلنے والے ہیں۔ اچھے دنوں کی امید کر سکتے ہیں۔ اگر آپ خاتون ہیں تو اپنے مخالفین کی فکر چھوڑ دیجئے۔ ان کے بارے میں آپ کے خدشات بے بنیاد ہیں۔ اپنے بزرگوں کی خدمت میں راحت ہے۔ کچھ مہمان آسکتے ہیں۔ کچھ لوگ سفر بھی کر سکتے ہیں اور ان کو سفر میں احتیاط برتنے کی صلاح دی جاتی ہے۔

۱۲۔...... ایسا لگتا ہے کہ آپ اپنے حالات سے خوش نہیں، اور ایک خلش آپ کو ہر

وقت پریشان کئے رہتی ہے۔ اپنا تجزیہ کیجئے۔ ہمت اور حوصلہ کے ساتھ عمل کیجئے اور حالات کو بدل ڈالئے۔ اگر حالات بدلنا آپ کے لئے مشکل ہے تو ان سے سمجھوتا کر لیجئے اور بھرپور زندگی جینے کی کوشش کیجئے۔ آپ اگر غور کریں تو آپ کی زندگی بھی کچھ لوگوں کے لئے باعث رشک ہوگی۔ انسان جب اپنے حالات سے مطمئن نہ ہو تو اپنے سے غریب اور کمزور لوگوں پر نظر ڈالے، ان کے ساتھ کچھ وقت گزارے تو بہت سکون ملتا ہے۔ آپ خاموشی کو پسند کرتے ہیں اور زیادہ تر خود بھی خاموش رہتے ہیں۔ سنجیدگی اور بردباری اچھی عادات ہیں، لیکن اتنی بھی نہ ہوں کہ لوگ آپ کو مغرور سمجھنے لگیں۔ غصہ ایک ہیجانی کیفیت ہے جس کا تعلق آپ کے مزاج سے ہے۔ یہ آپ کی شخصیت پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔ اپنے غصہ کو قابو میں رکھنے کی عادت ڈالئے۔ بے موقع طیش میں آجانے سے بات بگڑ جانے کا خطرہ ہو سکتا ہے۔ اگر آپ خاتون ہیں تو سلیقہ مند اور ہوشیار خواتین میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ آپ خود بھی حوصلہ مند ہیں اور دوسروں کا بھی حوصلہ بڑھانے کی کوشش کرتی ہیں۔ دور اندیشی سے کام لیجئے، کسی انجانے شخص پر اعتماد کرنے سے پہلے یقین کر لیجئے کہ آپ کا فیصلہ مناسب ہے۔ اگر کوئی اپنی استعداد اور صلاحیت کا اندازہ کئے بغیر اپنا نصب العین طے کر لیتا ہے تو بعد میں پچھتاوے کا شکار بھی ہو سکتا ہے۔ ناامیدی کے احساس سے بچنے کے لئے اپنی خواہشات کو اپنی استطاعت کے مطابق ڈھالیے۔ ○○

قابل مطالعہ کتابیں

نام کتاب : **تنقیحات**
مصنفہ : ڈاکٹر نیر جہاں
مبصر : مرغوب علی

ڈاکٹر نیر جہاں کی کتاب **تنقیحات** ''تخلیق کار پبلشرز'' نے اپنے روایتی انداز میں بہت عمدہ کاغذ پر شائع کی ہے۔ ڈاکٹر نیر جہاں نے **علامہ شبلی: ایک تنقیدی مطالعہ** نامی مقالہ پر ۱۹۹۵ء میں پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کی ڈگری حاصل کی تھی۔ ان کی زیر تبصرہ کتاب ان کے مختلف مضامین پر مبنی ہے جن کی مجموعی تعداد پندرہ ہے، اِن میں بالخصوص ''غالب کا تصور عشق، فن سوانح نگاری: ایک مختصر جائزہ، اردو میں سوانح نگاری کی روایت، سوانح نگاری میں شخصیت کا انتخاب، علامہ شبلی کے قومی نظریات، سوانحی ادب کا ایک معتبر نام: مرزا حیرت دہلوی، علی سردار جعفری کی شاعری میں عورت کا تصور، داغ دہلوی: اردو کا پہلا صاحب حیثیت شاعر، سرسید کے خوابوں کی ادھوری تعبیر: ایم۔ اے۔ او۔ کالج، نظیر اکبرآبادی: بنجارہ نامہ کے حوالے سے، 'فرات' کے نسوانی کردار......

یہ کتاب غالب اور شبلی سے شروع ہو کر حسین الحق کے ناول ''فرات'' تک جاتی ہے، یعنی کلاسک سے جدید...... بلکہ جدید تر تک۔ کتاب کے ہر صفحے پر...... وہ غالب ہوں یا علی سردار جعفری، داغ یا حسین الحق...... نیر جہاں کے تیز قلم نے تیز بہاؤ جھرنے کی طرح صفحات پر لہریں بنائی ہیں۔ ان کا مطالعہ سطر سطر، ان کی سوچ لفظ لفظ اور ان کا بیان اور بیان کی پختگی عنوان عنوان ظاہر ہوتی ہے۔ ان کا اسلوب دھیما، میٹھا اور پھیلتی ہوئی خوشبو سا ہے۔ ہر مضمون کا اختتام ان کے قطعی فیصلے پر ٹکا ہوا نہیں ہے، بلکہ اس میں رد و بدل کی گنجائش موجود ہے۔ ہر اچھا لکھنے والا کبھی بھی اپنی رائے پڑھنے والوں پر لادھ نہیں دیتا، بلکہ اپنی تحریر میں ایک آدھ ایسا جھروکہ چھوڑ دیتا ہے جس سے بحث کی روشنی یا بات کرنے کا دروازہ وا رہے۔ مجھے داغ پر لکھا ان کا مضمون دوسرے مضامین سے اس لئے زیادہ اچھا لگا کہ داغ کا چلبلا پن اور مصرعے کی

تیزی سے اردو شعراء نے بہت فیض اٹھایا ہے، مگر اقرار کم کیا ہے۔ سر سید کا ادھورا خواب، شبلی پر ان کے مضامین اور سوانح نگاری پر ایک دو نہیں...... تین مضامین اس بات کے غماز ہیں کہ انہوں نے مطالعہ کے ساتھ ساتھ اپنے لکھنے پر بھی خاص توجہ دی ہے۔ ورنہ سوانح نگاری جیسے موضوع پر تین مضمون لکھنا بچوں کا کھیل نہیں۔ جن لوگوں کو گئے وقت پر پڑنے والی پرچھائیوں کی تلاش رہتی ہے اور جو موجودہ وقت کے گزرتے ہوئے سنہرے چہرے پر اپنی نظر کی شبنم اُنڈھیلنا چاہتے ہیں، انہیں یہ کتاب ضرور پڑھنی چاہیے، کہ ایسے کام نہ روز روز ہوتے ہیں اور نہ اتنی عمدہ تحریریں روز وجود میں آتی ہیں۔ پھر کتاب کی زبان اتنی سہل اور شیریں کہ ایک بار پڑھنا شروع کر دیں تو مضمون پورا کئے بنا نہ چھوڑیں۔

ڈاکٹر نیر جہاں کی یہ کتاب پڑھنے کے بعد ان سے بہت سی امیدیں وابستہ ہو گئی ہیں، خدا کرے یہ امیدیں پوری ہوں، کہ سنجیدہ علمی کام یوں بھی اِدھر کم ہو رہے ہیں۔ OO

نام کتاب : **شعلوں کے درمیان**

شاعرہ : بلقیس ظفیر الحسن

مبصر : مرغوب علی

بلقیس ظفیر الحسن کا شعری مجموعہ **گیلا ایندھن** ۱۹۹۶ء میں شائع ہوا تھا۔ اب ان کا یہ تازہ شعری مجموعہ **شعلوں کے درمیان** ۲۰۰۴ء میں معرض وجود میں آیا ہے۔ بلقیس ظفیر الحسن معیاری ادبی رسائل میں چھپتی رہی ہیں۔ ان کے ڈرامے "شیشے کے کھلونے"، "بجھی ہوئی کھڑکیوں میں کوئی چراغ" وغیرہ سنجیدہ ناظرین سے داد حاصل کر چکے ہیں اور ان کی نظمیں ترجمہ ہو کر انگریزی اور ہندی میں بھی شائع ہو چکی ہیں۔ بلقیس ظفیر الحسن کے اس مجموعے میں عورت کے سارے روپ اپنی پوری شان اور احترام کے ساتھ موجود ہیں۔ کہیں وہ بیٹی ہیں......

اپنے فردوسی پروں سے مجھے ڈھک لیتی ہے
نرم سرگوشیاں کرتی ہے مرے کانوں میں
دمِ عیسیٰ کی طرح
کھینچ دیتی ہے میرے چاروں طرف اک حفاظت کی لکیر
بن گئی کب مری بیٹی مری ماں
مجھ کو پتہ ہی نہ چلا (صفحہ:۶۲)

آخری خواہش
میرے سنگ مزار پر لکھنا

فلاں سال کے فلاں مہینے فلاں منحوس دن
دنیا میں آئی
جینے کی کوشش میں مر مر کے
ہر روز جیا کرتی تھی
دفن ہے یہاں (صفحہ: ۶۴)

کیا کیجئے اس یوسف کا، سب دامن چاک ملے آگے سے
پر بلقیس کرے تکرار کہ کیوں اس پر وشواس نہیں ہے؟
(صفحہ: ۶۸)

بند موسم کے بادل آئے برسے بھی بہت
دل کہ سوکھا ٹھنٹھ تھا کمبخت کیا ہوتا ہرا
کون رہتا ہے وہاں، اب کیسا لگتا ہے وہ گھر
نام کیا اب بھی کسی دیوار پر ہوگا میرا
(صفحہ: ۷۱)

ہمیں چھیڑے نہیں بلقیس کوئی ہمارا آج جی اچھا نہیں ہے
(صفحہ: ۹۲)

نشیب میں پانی پینے والا میمنا
چاہے ثابت بھی کر دے کہ اس کے پینے سے
اوپر جانے والا پانی جھوٹا ہو نہیں سکتا تو بھی
اپنی جان بچا لینے سے قاصر ہی رہتا ہے
بھیڑیا اس پر حملہ کر دینے کا دوسرا
کوئی جواز ہمیشہ ڈھونڈ لیا کرتا ہے۔ (عراق، صفحہ: ۷۷)

نسائی مجبوریوں، جدائی، زمانے کی ستم ظریفی، بے ایمانی، موجودہ عہد کی کربناکیاں، ماں، بیوی، محبوبہ اور ایک معیاری سوچ رکھنے والی خاتون کو اگر ایک جگہ دیکھنا ہو تو بلقیس ظفیر الحسن کا تازہ مجموعہ **شعلوں کے درمیان** دیکھ لیں۔ اس شعری مجموعے سے ایک عام خیال کی نفی بھی ہوتی ہے، جو عام طور پر شاعرات کے بارے میں جڑ پکڑ گیا ہے۔ میر اور مصحفی کی نذر کی گئی غزلیں ان کے استادانہ طرز بیان کی نشان دہی کرتی ہیں۔ محدود سطروں میں اس اچھے شعری مجموعے پر اور کچھ لکھنا ممکن نہیں، ورنہ اِدھر چھپنے والے شعری مجموعوں میں اپنی اعلیٰ شناخت بنانے والی یہ کتاب بہت زیادہ کی مستحق تھی!

OO

نام کتاب : **سفید جنگلی کبوتر**

مصنف : منور رانا

مبصر : مرغوب علی

منور رانا مشاعروں کے مقبول شاعر ہیں۔ ان کے شعر خواص اور عوام دونوں کی دلچسپی کا باعث بنتے رہے ہیں۔ ان کا ایک شعر مجھے عرصہ سے یاد ہے......

گفتگو فون پہ ہو جاتی ہے رانا صاحب
اب کسی چھت پہ کبوتر نہیں پھینکا جاتا

اردو اور ہندی میں ان کے کئی شعری مجموعے آچکے ہیں اور مقبول بھی ہو چکے ہیں۔ اِدھر انہوں نے نثر میں طبع آزمائی کرنے کی ٹھانی تو ان کی کتاب **بغیر نقشے کا مکان** وجود میں آئی۔ اتفاق سے یہ کتاب دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا، مگر انہوں نے اپنی دوسری نثری تصنیف **سفید جنگلی کبوتر**، جو شاعر، ادیبوں اور شہروں کے شخصی خاکوں پر مبنی ہے، مجھے 'ادب کے ساتھ' عنایت کی۔ جو شوخی، طنز اور کاٹ ایک سنجیدگی کے ساتھ ان کے شعروں میں پنہاں رہتی ہے، وہی ان کی نثر میں بھی موجود ہے۔ کہیں کہیں تو ان کے نثری ٹکڑے کانچ کی طرح ذہن میں چبھتے ہیں اور پڑھنے والا تلملا کر رہ جاتا ہے۔ "عین رشید، شہود عالم آفاقی، اعزاز افضل، غزل کا گھر کراچی ہے نہ دلّی ہے، ہائے کل چار ورق کا یہ مقالہ غالب، میرے اندر کا مسلمان نہیں مرتا"، اور دوسرے کئی مضامین اور خاکے بہت دل جمعی سے لکھے گئے ہیں اور جملوں کی رفتار اتنی تیز ہے کہ ذرا نظر چوکی اور گئے معنی ہاتھ سے۔ جب کوئی شخص بہت اکیلا ہو، بہت اداس اور دُنیا یا خود سے اکتایا ہوا ہو، تب منور رانا کی یہ کتاب **سفید جنگلی کبوتر** اس کی سچی دوست ثابت ہو سکتی ہے۔ کتاب کے لئے عام طور سے کہا جاتا ہے کہ وہ تنہائی کی بہترین ساتھی ہوتی ہے۔ مگر کتاب کا خود بہترین ہونا بھی ایک شرط ہے اور منور رانا کی یہ کتاب بہترین ہی نہیں، پڑھنے والوں کو بہت دنوں تک اپنی گرفت میں رکھنے کی طاقت بھی رکھتی ہے......اور مشاعرہ پڑھنے والے شعراء کے لئے ایک چیلنج کا درجہ رکھتی ہے کہ وہ بھی خود کو ثابت کرنے کے لئے ایسی نہیں تو اس سے کچھ کم ایک کتاب ضرور ترتیب دیں۔

○○

نام کتاب : **فساد** (ناول)

مصنف : مہرالدین خاں

مبصر : مرغوب علی

مہرالدین خاں کا ناول "فساد" اس اہم سوال پر مبنی ہے جو وطن عزیز کی آزادی سے ذرا پہلے

سے ہر سیکولر آدمی کے ذہن میں کسی انگارے کی طرح سلگتا رہا ہے۔ فساد ہندوستان جنت نشان کے ماتھے پر ایک ایسے زخم کی طرح برسوں سے رِس رہا ہے اور اس زخم میں اب سڑاندھ بھی پیدا ہونے لگی ہے۔ تمام تر دعوے اور یقین دہانیوں کے باوجود اقلیتی فرقہ کب اس کے چنگل میں پھنس جائے یہ کوئی نہیں جانتا۔ کبھی بچوں کی معمولی جھڑپ، کبھی محبت کرنے والوں کی مہکتی سانسیں، کبھی کسی اسکوٹر اور رکشہ کی بھڑنت، بس ایک بہت ہی ذرا سی چنگاری اس بارود کے ڈھیر میں آگ لگانے کے لئے کافی ہوتی ہے۔ مہرالدین خاں نے بابری مسجد کی شہادت کے تناظر میں فساد کا رپورتاژ ترتیب دیا ہے، فساد میں چونکہ ہمیشہ ہی طرفداری کے الزامات سر اٹھاتے رہے ہیں، سو اس میں بھی اس نکتے پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس سے پہلے وبھوتی نرائن رائے کے ناول ''شہر میں کرفیو'' میں بھی یہی سب کچھ پڑھنے والے پڑھ چکے ہیں۔ اس ناول کا ایک کردار ناصر، جو سیکولر ذہن کا مالک ہے اور برے سے برے حالات میں بھی اپنا ذہنی توازن نہیں کھوتا، جب کرفیو کھلنے کے بعد اپنے دوست دوبے سے ملنے جاتا ہے اور دوبے کے گھر سے ذرا فاصلے پر فسادیوں کا شکار بن جاتا ہے، تب پڑھنے والے کے لئے ایسا لمحۂ فکریہ چھوڑ جاتا ہے جس پر ہر ذی حس اور سیکولر ذہن کو سوچنے کی ضرورت ہے۔ ناصر ''دوبے جی، دوبے جی'' چلاّتا رہ جاتا ہے اور دوبے کے ناصر تک پہنچنے تک ناصر کا کام تمام ہو جاتا ہے۔ زبان کی کچھ کمزوریوں اور مشاہدے کی کمی کے باوجود ''فساد'' ایک پڑھنے لائق ناول ہی نہیں، بلکہ بہت دنوں تک سوچنے اور سوچ کر کوئی مثبت حل نکالنے کے لئے مجبور کرنے والا ناول بھی ہے۔ ○○

نام کتاب : آواز کا لمس

شاعر : قمر سنبھلی

مبصر : مغیث الدین فریدی

قمر سنبھلی کی غزل ان کے پاکیزہ ذوق شعر اور فن پر غیر معمولی ریاض کی آئینہ دار ہے۔ نئے خیالات اور انوکھے احساسات کو انہوں نے دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔ غزل کی شاعری میں اگر دل شامل نہ ہو تو وہ صرف ذہنی ورزش یا شاعرانہ کاریگری بن کر رہ جاتی ہے۔ قمر سنبھلی نے اپنے سچے تجربات کو طرز ادا کی جدت سے پر لطف اور پر اثر بنا دیا ہے۔ فن کا جادو جگانے میں انہوں نے بڑی محنت کی ہے۔

غزل میں کہتا نہیں ہوں غزل بناتا ہوں
سخنوری بھی قمر ٹھہری کارِ شیشہ گری

ایک سچے شاعر کی طرح انہوں نے جو دیکھا اور جو محسوس کیا، اسے غزل کے آداب کو برقرار رکھتے ہوئے شعر کے پیکر میں ڈھال دیا ہے۔ ان کے نرم لہجہ نے ناسازگار حالات کی تلخی کو گوارا بنا دیا ہے۔ ان کے اکثر اشعار میں وہ کیفیت ملتی ہے جسے جگر مرادآبادی نے

"ماورائے سخن بھی ہے اک بات" کہا ہے۔

قدم قدم پہ فروزاں تھے نقش پا اپنے
مثال شمع تری رہ گزر میں ہم بھی تھے

بہت زیادہ صفائی نہ دیں اب آپ اپنی
ہمیں خبر ہے کہ پتھر کدھر سے آیا ہے

دولتِ کردار اگر نہ حاصل ہو
عظمتِ نام و نسب کچھ بھی نہیں

اب اپنے صحن سے کرچیں سمیٹتے رہئے
کچھ احتیاط سے شیشے کے گھر میں رہنا تھا

فارسی ترکیبوں سے غزل کے اشعار کی بندش کو چست کرنے کی مہارت ان کو حاصل ہے۔ یہ معنی خیز ترکیبیں شعر کی تاثیر کو بڑھا کر بلاغت کا حق ادا کرتی ہیں......

یہ کیسے چھوٹ گیا احتیاط کا دامن
ہمیں تو ان کے حصارِ نظر میں رہنا تھا

اس شہر سنگ میں کسے جاکر غزل سناؤں
میں نرم گفتگو کسی پتھر سے کیا کروں

بہا لہو جو خراشوں سے تب ہوا احساس
وہ شخص خنجر گفتار ساتھ رکھتا ہے

بیاض وقت یہ تحریر بیتے لمحوں کی
زبانِ وقت کا لکھا ہوا قصیدہ ہوں

زندگی کی بدلتی ہوئی قدروں کے عرفان سے قمر سنبھلی نے پیکر تراشی کے بھی نئے نمونے پیش کئے ہیں......

ہر ایک قدر تمدن کی دھوپ میں ہوئی گم
سب اجلے رنگ نئی روشنی نے چھین لئے

ہوائے وقت اڑا لے گئی نشاں سارے
ہم ان کی یاد کے سوکھے گلاب سے بھی گئے

مجھے یقین ہے "آواز کالمس" اہل نظر کے لئے خراج تحسین ضرور حاصل کرے گا۔ یہ ایک کشتۂ آشوبِ ہنر کا کلام ہے۔

معتبر کر تو دیا دیدہ وری نے مجھ کو　　　ہاں مگر کشتۂ آشوبِ ہنر ہو کے رہا

OO

نام کتاب : **ٹھہرے ہوئے لوگ** (افسانے)
مصنف : انجم عثمانی
مبصر : ڈاکٹر نگار عظیم

''شب آشنا'' اور ''سفر در سفر'' کے بعد انجم عثمانی کا یہ تیسرا افسانوی مجموعہ ہے، جس میں اکیس افسانے شامل ہیں۔ مجموعے کی ابتداء میں محقق پروفیسر گوپی چند نارنگ کی مدلل آرا اور بحث کے بعد کہانیوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ انجم عثمانی کا افسانوی سفر تقریباً چار دہائیوں پر محیط ہے۔ یہ بات بڑے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ یہ تخلیقی سفر قلمکار کی دیانتداری کا مکمل ثبوت ہے۔ انجم عثمانی اپنی راہ کے تنہا مسافر ہیں۔ موضوعات کے لحاظ سے بھی اور افسانے کی فضا کے لحاظ سے بھی۔ اس مجموعے کے بیشتر افسانے مسلم معاشرے، اس کی ادبی، تہذیبی، سماجی، سیاسی اور ثقافتی قدروں کے تال میل کا، اس کے ٹوٹنے بکھرنے اور پامال ہونے کے درد اور اضطراب کا آئینہ ہیں۔ نئی نسل کے سپاٹ، سرد اور جدت پسند جذبات سے وہ گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ افسانوں کے کردار اور فضا بیشتر جھنجھوڑ کر رکھ دیتے ہیں، اور نئی نسل کو نہ صرف پیغام دیتے ہیں بلکہ قائل کرتے ہیں کہ وہ اپنا فرض ادا کریں اور اس ٹوٹتی بکھرتی وراثت کو جو آخری سانسیں لے رہی ہے، زندگی عطا کریں۔

''شہر گریہ کا مکیں'' میں ماموں کی موت دراصل ماموں کی موت نہیں، انسانی قدروں کی موت ہے۔ پوری ایک تہذیبی وراثت کے سسکنے کا دردناک منظر ہے۔

''لالٹین بہت زوروں سے بھبھک رہی ہے، بلکہ جلنے کے درمیان قریب المرگ کی طرح سانسیں لے رہی ہے۔ قصبے کے بڑے دالانوں والا گھر سنسان اور اندھیارا ہے...... اور وہ تھرتھراتی لو کو بجھنے سے روکنے کی کوشش میں گھر کی دہلیز پر بیٹھا کانپ رہا ہے۔'' اپنے قصبے میں تاریک مستقبل کے خدشات سے شہر کی طرف قدم بڑھانے والا ''پیر بھائی'' اس حد تک ذہنی استحصال کا شکار ہوتا ہے کہ مستقبل کی تابناکی تو درکنار، بلکہ اس کا وجود ایک غیر متوازن علامت بن کر رہ جاتا ہے۔ شہروں کی پر رونق زندگی میں ''جسموں کی بھیڑ'' میں جسم بننے کی ناکام کوشش کرنے والا انسان بس ایک مردہ وجود ہے۔ ''برزخ'' اس کی بہترین مثال ہے۔ یہاں لال رنگ کی کاران پیدا ہونے والے خطرات کی علامت ہے جس نے زندگی سے اطمنان چھین لیا ہے۔ ''ٹھہرے ہوئے لوگ'' اور ''چھوٹی اینٹ کا مکان'' ان پامال ہوتی قدروں کی کہانی ہے جو کھنڈرات میں تبدیل ہو کر اپنے نقوش کھوتی جا رہی ہیں۔ کیوں کہ نئی نسل اس اکتا دینے والی زندگی سے گھبرا کر شہروں کی چکا چوند بھری رونق میں زندگی تلاش کرتے کرتے اپنی وراثت کو بھول جاتی ہے۔ لیکن چھوٹی اینٹ والے مکان کی بوڑھی آنکھیں اپنے ولی عہد کی واپسی کی منتظر ہیں۔

''ہمیں معلوم ہے کہ تم لوٹ کر آنے کے لئے نہیں گئے ہو، لیکن شاید یہ بتا دینا میرا فرض ہے کہ جو عمارت تم بنانا چاہتے ہو اس میں بغیر چھوٹی اینٹ کے پائیداری اور سچائی نہیں آسکتی۔ اب بھی وقت ہے کہ لوٹ آؤ اور ان گرتی ہوئی دیواروں کو نئی اینٹیں لگا کر تھام لو جن کو سنبھالتے سنبھالتے بوڑھے کاندھے تھک گئے ہیں۔ یہ عمارت گر گئی تو کسی نئی عمارت کے آثار تک نہ ملیں گے۔''

''ٹھہرے ہوئے لوگ'' میں بھی کرب کی ٹیسیں اس طرح ابھرتی ہیں......

''ٹھیک ہے، جاؤ کتابیں پڑھو، ہاسٹل کے کامن روم میں لڑکیوں کی سماجی برابری، ادب کے جمود، انسان کی تنہائی اور سیکس کے موضوعات پر سگریٹ کا تلخ دھواں چھوڑتے ہوئے بحثیں کرو تاکہ انسانی الجھنیں سلجھ سکیں، بھلے ہی حویلی کی منڈیر پر جمی ہوئی کائی اور گہری ہوتی رہے۔ اس کی اونچی اونچی چھتوں پر مکڑیوں کے جالے لپٹیں رہیں اور ایک دن دیمک اس ساری حویلی کو زمین دوز کردے۔ لیکن تمہیں اس سے کیا۔'' یہاں یہ بات بھی معنی خیز ہے کہ یہ مکالمے ایک لڑکی کی زبان سے ادا ہوتے ہیں۔ عورت خود زمین سے جڑی ہوئی ہے اور اسے تحفظ فراہم کرنا آج بھی وہ اپنا اولین فرض سمجھتی ہے۔ ''میری دنیا یہی ہے، مجھے یہیں اسی دنیا میں مہندی کے اسی درخت کو پانی دینا ہے۔ حویلی کی کائی آلود منڈیر کو صاف کرنا ہے تاکہ باہر کی تازہ ہوائیں آسکیں۔'' ''کھوکھلی راہوں کا مسافر'' زندہ دور کے مردہ سماج کی کہانی ہے۔ جہاں بھوک، جسم، دھماکے، فسادات، جنگیں اور لاشیں بے معنی ہو گئی ہیں۔ لفظوں کے معنی اور مفہوم کھو گئے ہیں۔ زرد چہرے، دھندلے لفظ اور بوڑھا سورج لمحہ لمحہ سسکتی، دم توڑتی تہذیب کا آئینہ ہے۔ ''منظر ابھی بدلا نہیں'' نہ صرف تہذیبی اور علمی قدروں کے زوال کا المیہ ہے بلکہ انسان کے ارضی ہوتے اور اس امانت کو واپس کرنے کے درمیان کا وہ وقفہ ہے جو زندگی سے زندگی چھین لیتا ہے اور اوراق سے لفظ، انتہائی عبرتناک ہے۔

''چنانچہ اب کتاب ابوزید کے سامنے تھی اور تشنگانِ علم لفظوں کے موتی چننے کے لئے خلیفہ الشیخ ابوزید مدظلہ کے سامنے دوزانو تھے۔ لہٰذا درس جاری رکھنے کے لئے اس نے نہایت بے قراری سے کتاب کھولی اور یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ کتاب کے تمام ورق بھی لق ودق صحرا کی طرح بالکل سادہ تھے۔''

''زنجیر بدل جاتی ہے'' انتہائی اثر انگیز کہانی ہے۔ بڑے موذی کو مارا نفس امارہ کو گر مارا۔ ''مانگو پناہ لفظوں سے کہ یہ صرف سایہ ہیں اور ایک دن انہیں پاش پاش ہو جانا ہے، بس یاد رکھو تم لوگ کہ لفظ نفس کی صورت دیوار ہیں۔''

''ورثہ'' کا بغدادی قاعدہ، فریب گزیدہ، گمشدہ تسبیح، گھنٹے والا بابا'' بھی قدروں سے جڑی ہوئی کہانیاں ہیں۔ ایک ہاتھ کا آدمی، طبقاتی استحصال کے علاوہ اچھائی اور برائی کی تفریق

مٹ جانے کا دردناک حادثہ ہے۔ نئی نسل تو اس حادثہ سے بھی آشنا نہیں۔" اگلی صبح انہوں نے دیکھا کہ بستی کے سارے بچے، دائیں ہاتھ والے کام بھی بائیں ہاتھ سے انجام دے رہے ہیں اور ان کے بھولے چہروں پر کسی کرب کے آثار نہیں ہیں۔"

"بارش، وہ اور میں"، "پہچان کے زخم"، "آپی" معصوم جذبوں کی گہری اور تہہ دار کہانیاں ہیں۔ جن کو پڑھ کر قاری یقیناً وہی شدت محسوس کرے گا جو قلمکار کا مقصد ہے۔ آخیر میں ایک بات اور کہوں گی کہ انجم عثمانی کی کہانیوں کو پڑھ کر درد، احساس، ٹیس اور جذبوں کی جو شدت محسوس ہوتی ہے، اسے بیان کر پانا مشکل ہی نہیں، ناممکن ہے۔ زبان کے لحاظ سے انجم عثمانی خود ایک اسکول ہیں، اس تعلق سے اس مجموعے کی تمام کہانیاں قاری کو باندھے رکھتی ہیں۔ امید ہے کہ انجم کے اس سفر کا اگلا پڑاؤ "مدرسے، مولسری کے پیڑ، چھوٹی اینٹ کا مکان، گمشدہ تسبیح" کے ورثہ سے باہر کبوتوں بھرا آسمان میں نئی وسعتیں پائیں گے اور نئی راہیں تلاش کریں گے۔ کتاب کا سرورق، کاغذ، چھپائی اور تزئین کاری کے لئے تخلیق کار پبلشرز بھی مبارکباد کے مستحق ہیں۔ ○○

نام کتاب : **زندہ اپنی باتوں میں** (انٹرویوز)

مصنف : فیاض رفعت

مبصر : انور کمال حسینی

فیاض رفعت متعدد صلاحیتوں کی حامل شخصیت ہیں۔ وہ افسانہ نگار بھی ہیں اور شاعر بھی، منتظم بھی ہیں اور مترجم بھی، محقق بھی ہیں اور رابطہ عامہ کے ماہر بھی۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں انہوں نے ایک ذمہ دار آفیسر کی خدمات نبھائی ہیں اور اب وہاں سے سبکدوش ہونے کے بعد اردو زبان و ادب کی آبیاری میں لگ گئے ہیں۔ وہ بے پناہ تخلیقی صلاحیتوں کے مالک ہیں اور اس کا ثبوت ان کے شعری اور افسانوی مجموعے ہیں جو شائع ہو چکے ہیں۔ "اردو افسانے کا پس منظر" ان کا تحقیقی کام ہے۔ دوران ملازمت ریڈیو اور ٹی۔ وی۔ کے وسیلے سے انہوں نے اردو کے دلچسپ اور معلوماتی پروگرام اردو عوام تک پہنچائے۔ ان پروگراموں میں وہ انٹرویوز بھی ہوتے تھے جو وہ اردو کی مشہور و معروف علمی، ادبی اور اہم شخصیات سے اپنے میڈیم کے لئے کیا کرتے تھے۔ زیرتبصرہ کتاب "زندہ اپنی باتوں میں" ہے اور اس میں ان تین اردو والوں کے انٹرویوز شامل ہیں جن کی ادبی اور فلمی، دونوں دنیاؤں میں شخصیت مستحکم تھی۔ یہ شخصیات راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی اور خواجہ احمد عباس ہیں۔ یہ تینوں ہی اردو کے بے مثل قلمکار اور فلمی دنیا کے وہ نمایاں افراد ہیں جن کی کہانیوں پر ایسی فلموں کی تشکیل ہوئی جن میں زندگی اور سماج کے رنگارنگ رویوں کی عکاسی کی گئی ہے۔ یہ عصمت چغتائی کی "ضدی" ہو

یا راجندر سنگھ بیدی کی ''دستک'' یا خواجہ احمد عباس کی ''سات ہندوستانی'' اور ''انہونی''۔ ان میں ہمارے ہی کردار اور ہمارے ہی مسئلے ہیں۔ ان تینوں قلمکاروں کی لکھی فلموں میں زندگی بہ مطابق اصل ہی ملتی ہے۔ وہی مسائل، وہی مرحلے، وہی شکوے، وہی شکایتیں جو زندگی کا حصہ ہیں، وہی سب کچھ ان کی فلموں کی بھی اساس ہے۔ فیاض رفعت نے ان لوگوں سے اپنے انٹرویوز میں ان کے خیالات اور نظریات کی شکل میں گویا ایک خاص عہد کی ثقافت، تہذیب، ادبی اور فلمی رویوں کو محفوظ کر لیا ہے جو آئندہ متعلقہ جہات میں ریفرنس کا کام دیتے رہیں گے۔ اپنے متن کے پیش نظر کتاب کا نام بہت بامعنی ہے۔ اس حوالے سے اگر بیدی، عصمت اور عباس اپنی باتوں میں زندہ ہیں تو زندگی کا کریڈٹ فیاض رفعت کے لئے بھی ہے جس نے اپنے تیکھے اور پر مغز سوالات سے ان تینوں کو کھلنے اور وضاحت سے جواب دینے پر مجبور کیا۔ ڈیمائی سائز کے ۱۱۰ صفحات کی یہ کتاب لیزر کمپوزنگ میں صاف ستھری شائع ہوئی ہے جو اپنے متن کے پیش نظر ایک اہم پیشکش ہے۔ OO

نام کتاب : **پھول جب کھلتے ہیں** (مجموعۂ نظم)
شاعر : شاہد کلیم
مبصر : سلیم انصاری

''پھول جب کھلتے ہیں'' شاہد کلیم کا تیسرا تخلیقی اظہار ہے، جو ان کی نظموں پر مشتمل ہے۔ اس سے قبل ان کے دو شعری مجموعے ''زیر بار'' اور ''موسم موسم روپ'' ناقدین شعر و ادب کو متوجہ کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔ چونکہ شاہد کلیم جدید شاعر ہیں، لہٰذا موجودہ عہد کے مسائل و مصائب نیز حادثات و واقعات کو اپنے مخصوص Perspective میں دیکھنے کی جرأت مندی ان کی نظموں کے باطنی نظام کو معتبر بناتی ہے۔

شاہد کلیم کی نظموں میں استعمال ہونے والے استعارات و علامت وہی ہیں جنہیں جدید شعراء عام طور پر استعمال کرتے ہیں۔ لیکن ان الفاظ کے استعمال کی سلیقہ مندی نے، شاہد کلیم کی نظموں کو معنوی سطح پر نئے مفاہیم سے آشنا کیا ہے۔ جنگل، پتھر، ریت، دریا، ہوا، پھول، چراغ، گھر، سمندر، سراب، عکس، پانی، دشت، شجر، اور پرندے جیسے عام طور پر استعمال ہونے والے الفاظ ان کی سوچ کی شعری اور تخلیقی معنویتوں کو خلق کر کے، اظہار کی نئی دشاؤں میں منعکس کرتے ہیں۔ شاہد کلیم محبتوں کے شاعر ہیں، پھول، تتلی، خوشبو، اور ستاروں کے شاعر ہیں۔ لیکن عصری آگہی سے قطعی بے خبر نہیں ہیں۔ ان کے یہاں صدیوں پرانی تہذیبی وراثتوں کے کھو جانے کا ڈر، تہذیبی قدروں کے زوال کا شدید احساس اور فرد و معاشرے کے درمیان ٹوٹتے ہوئے رشتوں کی کربناک سچائیوں کو موضوع فکر بنایا گیا ہے......

چھتوں پہ کبھی
اور کبھی آنگنوں میں
تجھے اپنی بانہوں میں بھینچے ہوئے
گھومتے تھے خراماں
تو بالک تھا ضدی، شریر اور چنچل
چمکتے ہوئے چاند سے کھیلنا چاہتا تھا
اسے رو رو کے مانگتا تھا

(نظم: گمشدہ لمحوں کی دستک)

ندی، جھیل، جھرنا، سمندر
پہاڑوں کے پیچھے تمازت کو اپنی لٹا کر
سلگتا ہوا سرخ سورج
کہیں سو گیا ہے
پرانے درختوں نے
بادل کے ہونٹوں کا رس پی لیا ہے
کسی کے خزانے میں
میرے لئے اب بچا کچھ نہیں ہے
مجھے آخری نسل ہونے کے بھی جرم میں
جھیلنا عذاب ہے......

(نظم: آخری نسل کا نوحہ)

یہ نظم گمشدہ تہذیبی وراثتوں کا نوحہ ہی نہیں بلکہ یہ اعلامیہ بھی ہے کہ تہذیبی قدروں کا زوال مسلسل ہو رہا ہے۔ لہٰذا آخر میں آنے والی نسل کو شدید عذاب جھیلنا ہے۔ بے تہذیب ہونے کا عذاب، بھٹکاؤ اور بکھراؤ کا پیش خیمہ ہے۔ لہٰذا اپنی تہذیبی وراثتوں کو محفوظ رکھنا بے حد ضروری ہے۔ نظم کی فضا مایوس کن، لہجہ مدھم مگر جذبہ شدید ہے۔
شاہد کلیم کے تخلیقی سفر کا آغاز ایسے ماحول میں ہوا جب جدید شعری تجربات کے خدوخال رفتہ رفتہ واضح ہونے لگے تھے اور شاعری ایک نئی کروٹ لے رہی تھی۔ شاعری کو عصری تقاضوں اور ضرورتوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوششیں بھی ہو رہی تھیں اور اظہار کے لئے نئے وسیلوں کی تلاش کا عمل بھی شدید تھا۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ شاہد کلیم اپنے عہد کے مسائل و مسائب پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ الیکٹرانک میڈیا کی تیز رفتاری اور معاشرے میں لوگوں کی تبدیل ہوتی ترجیحات نے یقینی طور پر تخلیقی ادب پر اپنے اثرات مرتب کئے ہیں۔

انسان مشین بناتا ہے اور مشین انسان کو Replace کر دیتی ہے۔ یہ ایک ایسی کشمکش ہے جو انسان اور مشین کے درمیان تصادم کا سبب ہے اور یہی تصادم تہذیبی قدروں کے زوال کا سبب ہے۔ مادی ترقی نے انسان کے ذہن کے بجائے پیٹ سے سوچنا سکھا دیا ہے، اور یہیں سے شروع ہوتی ہے خود غرضی، کم ظرفی اور کمینگی کی کہانی، جو یقینی طور پر تخلیقیت کا حصہ بن جاتی ہے۔ چونکہ شاہد کلیم ذہین تخلیق کار ہیں، لہٰذا ان کے یہاں بھوک، فساد، تنہائی، خوف، دہشت، تشکیل اور نسلوں کی بے روا روی کے موضوعات نہایت سادگی اور معصومیت سے تخلیقی فن پاروں میں ڈھل جاتے ہیں۔ زندگی کے حوالے سے منفی اور مثبت ہر دو طرح کے زاویے شاہد کلیم کی نظموں میں دکھائی دیتے ہیں۔ ○○

نام کتاب	:	**منظر، موسم، خواب**
شاعرہ	:	سیما فریدی
مبصر	:	مرغوب علی

کچھ دنوں پہلے سیما فریدی کا شعری مجموعہ ''منظر، موسم، خواب'' پندرہ آراء کے ساتھ شائع ہوا۔ ان لکھنے والوں میں دوسرے لوگوں کے علاوہ عنوان چشتی اور مناظر عاشق ہرگانوی جیسے معتبر اور جید ادیب بھی ہیں۔ عام طور پر فلیپ اور کتاب کے اندرون میں جو تحریریں ہوا کرتی ہیں وہ توصیفی اور مددگار ہوتی ہیں۔ ان تحریروں کے بنائے ہوئے ہالے میں ہی قاری کتاب سے ہو کر گزرتا ہے اور اپنے نظریہ اور سوچ کا بہت کم استعمال کرتا ہے۔ شاعرہ کے اس نقطۂ نظر......

سب کاموں کے ہیں سہارے   اُٹھا کر پھینک دیں بیساکھیوں کو

......کو مدِنظر رکھتے ہوئے دیکھیں تو ''منظر، موسم، خواب'' کے صفحات پر غزل کے کئی رنگ اور کئی موسم ہیں۔ کہیں قدیم تراکیب، کہیں نئے استعارے، کہیں کمان سے نکلتے ہوئے تیر سے مصرعے، کہیں ایسی سستی......

دیکھ تیرے بغیر ہے اے دوست   زندگی کتنی نامکمل سی

پروین شاکر کے لہجے کی بازگشت ان شعروں میں موجود ہے......

کہیں قریب کہیں میرے آس پاس ہو تم
بتا رہی ہے دلِ بے قرار کی خوشبو

کھل اٹھے پھر گلاب سے لمحے   اس کو دیکھا تو ہنس پڑی خوشبو
ہوش خوشبو کے اڑ گئے ہوں گے   پھول کو اس نے جب چھوا ہوگا

وہ لڑکیاں گلاب اگانا بھی سیکھ لیں
بالوں میں جن کو پھول لگانے کا شوق ہے

جہاں انہوں نے خود کو سنبھال کر اور ہوا میں اچھلتے لہجوں سے خود کو بچا کر شعر کہے ہیں، وہ کامیاب ہیں......

تلاش کرتی پھری جا بہ جا میں بچپن کو
سجا کے پلکوں پہ اپنی شرارتوں کے چراغ

ڈوب ہی جاتا ہے ہر شام چمکتا سورج
دو گھڑی بعد یہ شہرت کی ہوا کیا ہوگی

ذرا سی بات پر روٹھا ہے مجھ سے
یقیناً پیار وہ کرتا ہے مجھ سے

زمانے سے گلہ احباب کی باتوں سے شکوہ ہے
ہیں اپنے رنگ کچے اور برساتوں سے شکوہ ہے

ایسے اور بہت سارے شعر بھی کتاب کے صفحات میں محفوظ ہیں۔ کچھ شعر جن میں ایک لفظ کم ہے یا جو وزن پر پورے نہیں اترتے......

حسن اخلاق سے بڑھ کر کوئی...... حسن نہیں
کوئی خوشبو نہیں اخلاق کی خوشبو کی طرح

صفحہ ۱۵۳ / پر یہاں ''بھی'' یا اس کے وزن کا ایک لفظ ہونا چاہیے......

نہیں...... اس کو گنوانے کا دکھ مجھے تنہا
بچھڑ کے مجھ سے عجب کیفیت تھی اس کی بھی

صفحہ ۱۲۵ / پر، یہاں ''ہے'' کی بہت ضرورت ہے......

نہ خیالوں میں...... نہ خوابوں میں ڈھونڈئے اب مجھے کتابوں میں

صفحہ ۵۵ / پر ''اور'' کہاں کھو دیا......

اب یہ الزام کاتب کے سر جائے گا یا شاعرہ کے، یہ وہ جانیں۔ قطع نظر ان سب باتوں کے موجودہ شاعرات میں ابھرنے والی اور یجنل شاعرات میں ایک اچھی ذہین شاعرہ کا اضافہ ہوا ہے۔ سیما فریدی اگر اسی طرح غزل لکھتی / کہتی رہیں تو ایک دن بہت اچھی شاعرہ ثابت ہوں گی۔ ○○

نام کتاب : خوف کے آسمان تلے (افسانے)

مصنف : مبین مرزا

مبصر : مرغوب علی

مبین مرزا ایک عرصہ سے کراچی سے سہ ماہی ''مکالمہ'' کا اجرا کرتے آرہے ہیں۔ ان کے پچیس سالہ تخلیقی سفر کا انتخاب ان کا تازہ کار افسانوی مجموعہ ''خوف کے آسمان تلے'' پچھلے

دنوں منظر عام پر آیا، زیر تبصرہ مجموعے کا ابتدائیہ ان کے ذہنی افق کی کشادگی اور ان کے علم کی گہرائی کا غماز ہی نہیں، بلکہ ہمارے لکھنے والوں کے لئے ایک سبق بھی ہے۔

۱۲؍افسانوں کا یہ مجموعہ حقیقت کی زمین پر بیٹھ کر خوابوں کے قلم اور زندگی کی تختی پر اس ڈھنگ سے لکھا گیا ہے کہ ادھر چھپنے والے دوسرے افسانوی مجموعوں میں یہ پہلا مجموعہ ہے، جس میں قصے ڈھونڈنے کے لئے اپنی دھرتی کی مٹی کو چھاننے پر ہی سارا زور صرف کیا گیا۔ کراچی ایک لمبے عرصے سے کسی پھوڑے کی طرح دُکھ رہا ہے۔ مبین مرزا نے اپنے قلم کی ٹارچ کے دائرے سے جگہ جگہ فوکس کیا ہے اور کسی مشاق جراح کی طرح زخم کے کیسے کیسے انگور پھوڑے ہیں۔ ان کا افسانہ ''خواب ہارا ہوا آدمی'' جو ضمیر نیازی کے انتخاب ''زمین کا نوحہ'' میں اشاعت کے بعد پڑھنے والوں سے داد حاصل کر چکا ہے، اس نزاکت، دل جمعی اور خلوص سے لکھا گیا ہے کہ اس موضوع پر درج دوسرے کئی افسانوں سے سبقت لے گیا ہے۔ ان کی تازہ کاری اس مجموعے کے ہر صفحے پر بہار دکھا رہی ہے۔ افسانہ ''بے خواب پلکوں پر ٹھہری رات'' میں ایک جگہ درج ہے...... ''ادب تو خود ہی ملک وقوم کی سوشل ہسٹری ہوتا ہے۔'' (ص:۹۴) پاکستان کے موجودہ معاشرے کی سوشل ہسٹری پڑھنی ہو تو ان کا یہ افسانوی مجموعہ ان کے شہروں، گاؤں، زندگی کی کھینچ تان، مصلحت، محبت، نفرت، ریاکاری، انجلی اور ملکاں بی بی جیسے تمام مراکز پر غور وفکر کی دعوت دیتا ہے۔ مختصر ناولٹ ''قید سے بھاگتے ہوئے'' ان کی بھرپور فنی چابکدستی کا غماز ہے۔ ان کے جملے اور لفظوں سے بنائے گئے پیکر نہ جانے کیوں راجندر سنگھ بیدی کی یاد دلاتے ہیں۔ ان کا یہ مجموعہ سینج کر رکھنے کے لائق ہے۔ اگر کسی کو اپنی تنہائی کو بہلانا ہو تو اس کتاب کو سرہانے پر رکھنا چاہئے۔ OO

نام رسالہ : **تشکیل** (سہ ماہی، شمارہ ۴۶؍سے ۵۰)

مدیر : احمد ہمیش

مبصر : مرغوب علی

''تشکیل''، شمارہ ۴۶؍تا ۵۰، بابت ستمبر ۲۰۰۳ تا نومبر ۲۰۰۴ اپنی پوری آب وتاب اور شاک انگیزیت کے ساتھ پچھلے دنوں منظر عام پر آیا، موجودہ شمارے میں ''پردہ اٹھتا ہے''، ''ہم سخن فہم ہیں''، ''دلال ابن دلال''، ''ہماری کہانی کی تاریخ''، ''تعریفی دیباچے اور جعلی شعراء''، ''قحط الرجال میں مصوری''، ''تحریری مطالعہ (کتابوں پر مفید تبصرے) ''قدرت اللہ شہاب'' (شہاب نامہ کے حوالے سے)، ''حالی کے بعد والے'' سکندر احمد، ''ایک آدرش سوانح'' (امینہ رئیس فروغ)، ''قیامت جاریہ'' (احمد ہمیش)، ''بے عزتی'' (محمد الیاس)، ''فرار از گل حکمت'' (سمیع آہوجہ)، ''حاتم طائی کا زوال'' (سلیم اختر)، کہانیاں، نظمیں، غزلیں، گیت جیسی انگارہ

چیزیں پڑھنے اور سوچنے، بلکہ دیر تک سوچنے پر مجبور کرتی ہیں۔ اس شمارے میں جدا ہو جانے والے فنکاروں کے لئے تشکیل کتنا غمگین ہے، اس کا اندازہ ''سچے، جید'' اور کبھی نہ بھلائے جانے والے ''ضمیر نیازی'' کے لئے لکھے گئے ان جملوں سے کیا جا سکتا ہے......

''ادب و صحافت کے ضمیر تھے، گویا اسم با مسمیٰ تھے۔ ان کے بعد دنیا میں شاید ہی کوئی دیانت دار صحافی موجود ہو۔''

اس کے علاوہ احمد ہمیش کی سوانح کا ایک حصہ جو ''مکر چاندنی'' کے عنوان سے اس شمارے میں شامل ہے، وہ بھی خاصے کی تحریر ہے۔ یہ سوانح جب کتابی صورت میں شائع ہوگی تب کا حال تب جانیں گے، لیکن اس کی تحریر کشادہ، ہنگامہ خیز ہوگی۔ اس کا اندازہ اس کے اس چھوٹے سے ٹکڑے سے کیا جا سکتا ہے۔ سہ ماہی پرچوں میں ''تشکیل'' ہمیشہ ہی سچ کا مشعل بردار رہا ہے۔ ہر چند کے موجودہ عہد میں سچ کے طرفداروں کو گھاٹے کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ مگر جو سچ کے داعی ہوتے ہیں، مشکلیں ان کے گرد پا میں رہتی ہیں۔

ادبی بے ایمانی، جعلی شہرت اور تعلقات کی بیساکھیوں پر اپنے قد کو بلند کرنے والے جہاں کہیں بھی ہوتے ہیں، ''تشکیل'' ان کا شکار کرتا رہتا ہے۔ بقول راجندر سنگھ بیدی...... ''اگر دنیا میں حسین عورتوں کے لئے جگہ ہے تو اکھڑ مرد کا بھی اپنا مقام ہے۔'' خدا کرے ''تشکیل'' اکھڑ مرد کی مردانگی کو ہمیشہ قائم رکھے۔ OO

نام کتاب : کتنے پاکستان (ناول)

مصنف : کملیشور

مبصر : ولی محمد چودھری

''کتنے پاکستان'' تاریخی اور تہذیبی تفصیلات کے حوالے سے شاندار ناول ہے۔ ناول کی تکنیک خاص طور سے منفرد اور پراثر ہے۔ تکنیک ہی کی وجہ سے بے شمار تاریخی اور تہذیبی واقعات بہت آسانی سے ناول میں یکجا ہو گئے ہیں، بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ یہ واقعات ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے ہیں۔

کملیشور بہت سے ٹی۔ وی سیریل اور فلموں کے اسکرپٹ لکھ چکے ہیں۔ لہٰذا وہ جانتے ہیں کہ کس طرح بیانیہ کو منظر نامے میں تبدیل کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کلیشور نے اس ناول میں واحد متکلم کی جگہ ایک ادیب کو پیدا کیا اور اس کی عدالت لگوا دی۔ اس طرح پورا ناول جو کہ بیانیہ کے بوجھ سے یا تو بوجھل ہو جاتا یا اپنا رس کھو دیتا، وہ مناظر اور مکالموں کی وجہ سے رواں دواں ہو گیا اور ناول کو پڑھنا بھی آسان ہو گیا۔ اس طرح ناول کی بہت سی خوبیوں میں سے ناول کی شاندار فارم بھی ایک بڑی خوبی ہے۔

پاکستان لفظ کو خون خرابے، نفرت، تہذیبی تصادم، تاریخی جبر، علیحدگی پسندی، جنگ اور انتہا پسندی کی علامت کے طور پر برتا گیا ہے، جو اس ناول کی خوبصورتی بھی ہے اور تجربہ بھی......

"پاکستان ۱۴/اگست ۱۹۴۷ء کو نہیں بنا تھا، بلکہ انسانی تاریخ میں اس سلسلے کا وجود بہت پرانا ہے۔"

"۱۶۵۹ء میں اورنگ زیب نے خود اپنے بڑے بھائی دارا شکوہ کو شکست دے کر ہندوستان میں ہی اپنا پاکستان بنایا تھا۔"

......ایک اور اقتباس دیکھئے......

"ادیب نے تب ٹوکا......تو، سیف الدین سوز صاحب کشمیر کے یہ ہندو پنڈت اپنا ہندو ہوم لینڈ، اپنا ہندو پاکستان کیوں مانگ رہے ہیں؟ پاکستان سے پاکستان پیدا ہوتا ہے۔ یہ چھوت کی بیماری ہے۔ جب تک مذہب، نسل، ذات اور دنیا کی پہلی طاقت بننے کا نشہ نہیں ٹوٹتا، جب تک اقتدار اور برتری کی ہوس نہیں ٹوٹتی، تب تک اس زمین پر پاکستان بنائے جانے کی مہلک روایت جاری رہے گی۔"

اس ناول میں بابری مسجد کے سلسلے کے بھی بہت سے سولات اٹھائے گئے ہیں اور تاریخی حوالوں سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ بابری مسجد نہ تو بابر نے بنوائی اور نہ ہی رام مندر کو بابر نے توڑا۔ بابری مسجد رام جنم بھومی کا جھگڑا انگریزوں کا پیدا کیا ہوا ہے۔ انگریزوں نے ہندو مسلم اتحاد کو ختم کرنے اور فرقہ وارانہ منافرت پھیلانے کے لئے جو سازشیں کیں، بابری مسجد کا جھگڑا انہیں سازشوں کا نتیجہ ہے۔ ناول میں ادیب کی عدالت لگی ہوئی ہے۔ بابر اپنی صفائی دے رہا ہے۔ اس وقت ایک انگریز، جس کا نام اے۔ فیوہرہے، کہتا ہے......

"۱۸۵۷ء میں جو ہندو مسلم ایک ہوئے تھے، انہیں الگ الگ رکھا جائے، نہیں تو انگریز حکومت چلنے نہیں پائے گی۔ میں نے بابری مسجد پر لگا ابراہیم لودھی کا جو کتبہ تھا، اسے پڑھا تھا اور جان بوجھ کر اسے مٹا دیا تھا...... اور بابر نامے کے صفحات غائب کئے گئے، جو اس بات کا ثبوت دیتے ہیں کہ بابر اودھ تو ضرور گیا لیکن وہ ایودھیا نہیں گیا۔"

عدالت میں بابر موجود ہے۔ ادیب جج کی حیثیت سے اس سے بہت سے سوال پوچھتا ہے۔ ایک جگہ ادیب بابر سے کہتا ہے......

"تو پھر سیدھے سیدھے اپنی بابری مسجد کا قصہ سناؤ۔"

بابر کہتا ہے......

"آگرہ میری راجدھانی تھی۔ آپ سوچئے۔ اس وقت ہندوؤں کے کرشن کو

بھگوان اور اوتار قبول کیا جا چکا تھا۔ ان کی جائے پیدائش متھرا میں تھی۔ میری راجدھانی آگرہ سے صرف پچاس میل دور...... اگر مجھے توڑنا ہی ہوتا تو میں کرشن کی جائے پیدائش نہ توڑتا؟ بھاگا بھاگا ایودھیا تک جا کر رام کی جائے پیدائش کیوں توڑتا؟ کیوں کہ رام تو بھگوان ہوئے تلسی داس کے بعد...... اور میرے سامنے تلسی داس بچہ تھا۔ اس نے رامائن میرے مرنے کے بعد لکھی۔"

ایسے ہی بے شمار تاریخی اور تہذیبی سوالوں اور جوابوں سے یہ ناول بھرا ہوا ہے۔ ہر ذی شعور اور سنجیدہ قاری کے لئے یہ ناول ایک روشن کتاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ خورشید عالم نے ترجمہ بھی اچھا کیا ہے۔ کاغذ اور طباعت بھی شاندار ہے۔ OO

نام کتاب : **پرچم گردباد** (مجموعہ غزلیات)
شاعر : مظفر حنفی
مبصر : ڈاکٹر محبوب راہی

تمام اردو دنیا میں معروف و مقبول صف اول کے شاعر، ادیب، نقاد، محقق اور مترجم ڈاکٹر مظفر حنفی کی اردو شعر و ادب کی مختلف اصناف پر مشتمل چھ درجن سے زائد کتابیں تا حال منظر عام پر آ چکی ہیں اور ارباب ذوق نیز اصحاب نقد و نظر سے خراج داد و تحسین پا چکی ہیں۔ جن میں ان کے محض شعری مجموعوں کی تعداد ایک درجن ہے۔ حال ہی میں ان کا تازہ ترین مجموعہ غزلیات "ہاتھ اوپر کئے" منظر عام پر آ چکا ہے۔ اس کے علاوہ اس سے قبل کے مجموعے "یا اخی" ان دونوں کو چھوڑ کر سابقہ آٹھ مجموعوں میں شامل زائد از ایک ہزار غزلیات (نظمیں، قطعات اور رباعیات کو چھوڑ کر) میں سے چار سو غزلیں قلم زد کر کے چھ سو باون منتخب غزلوں پر مشتمل ایک منفرد، انوکھا معیار و وقار کا حامل کلیات نما ضخیم انتخاب (پرچم گردباد) کی صورت میں ڈاکٹر مظفر حنفی کے فرزندان نے پیش کیا ہے۔ اپنے پیش لفظ میں سابقہ مجموعوں کا تذکرہ کرتے ہوئے "پرچم گردباد" کی اشاعت کی غرض و غائیت کے بارے میں حنفی صاحب لکھتے ہیں......

"جیسا کہ ہم اردو میں لکھنے والوں کا مقدر ہو چکا ہے ان میں سے کسی کا ایڈیشن ہزار پانچ سو نسخوں سے زائد پر مشتمل نہیں تھا۔ چنانچہ اب یہ بازار میں قارئین اور شائقین ادب کے لئے دستیاب نہیں ہے۔ اس لئے جی چاہتا تھا کہ آخری دو شعری مجموعوں کو چھوڑ کر بقیہ میں شائع شدہ غزلوں کا ایک سخت اور جامع انتخاب منظر عام پر آ جائے، تا کہ نئی نسل کو بھی میری تخلیقی تگاپو کا اندازہ ہو سکے۔"

اس انتخاب کی روشنی میں مظفر حنفی کی تخلیقی تگاپو کا اندازہ لگانے سے پہلے اس حقیقت کا جاننا ضروری ہے کہ ان کی شاعری، لب و لہجہ، رنگ و آہنگ، اور فکر و رجحان کے اعتبار سے دو حصوں

میں تقسیم ہوتی ہے۔ (حالانکہ تقسیم اور درجہ بندی کا یہ عمل خاصہ دشوار ہے اور غیر فطری بھی۔)
پہلا روایتی اور نیم ترقی پسندانہ خیالات پر مبنی شاد عارفی کی مکمل اتباع میں خالصتاً طنزیہ رنگ جو ان کے دو ابتدائی شعری مجموعوں "تیکھی غزلیں" اور "صریر خامہ" کی غزلوں میں نسبتاً زیادہ واضح طور پر جھلکتا ہے۔ اس کے بعد والے چھ مجموعے (پانی کی زبان، طلسم حرف، دیپک راگ، یم بہ یم، کھل جا سم سم، اور پردۂ سخن) ان لازوال شعری تخلیقات سے آراستہ ہیں جنہیں مظفر حنفی کے فطری اور بنیادی اسلوب میں خضریت، تجریدیت، علامت نگاری، پیکر تراشی، اور داخلی کیفیات کی معتدل اور متبادل آمیزش سے اختراع کردہ اچھوتا، انوکھا، دلکش، تیکھا اور منفرد رنگ و آہنگ نیز وہ صحتمند، غیر مصلحت پسندانہ، مردانہ، پروقار، اور تازہ کار لہجہ چمکتا دھمکتا ہے، جو مجموعی طور پر ان کی منفرد اور مخصوص تخلیقی شناخت کا وسیلہ قرار پاتا ہے۔
"پرچم گرد باد" میں سخت انتخاب کے بعد شامل مظفر حنفی کے کم و بیش نصف صدی پر محیط آٹھ شعری مجموعوں پر مبنی تخلیقی سرمایئے میں سے پانچ پانچ اشعار پر مشتمل ساڑھے چھ سو غزلیں بیک وقت اور بیک نظر مطالعے کے نتیجے میں پانچ دہائیوں سے جاری ان کے تخلیقی سفر کے دوران راستوں کے نشیب و فراز، لحہ لحہ بدلتے رنگوں، لہجہ و آہنگ، اور مذاق و معیار کے اتار چڑھاؤ، جذبات و رجحانات کے مختلف سمتوں میں بہتے دھاروں، فکر و تخئیل کے دلکش نظاروں، نت نئے نظریاتی و تخلیقی تجربوں میں شریک رہتے ہوئے ذوق سخن کو خوب خوب سیراب کیا جا سکتا ہے۔ از اول تا حال اردو شاعری کے تینوں ادوار میں روایت، رومانیت، کلاسیکیت، ترقی پسندی اور جدیدیت پر مبنی ادبی نظریات، تحریکات اور رجحانات سے بہ یک وقت آگہی اور واقفیت حاصل کرنے کے لئے "پرچم گرد باد" سے بہتر افادیت اور اہمیت کا حامل کوئی اور شعری مجموعہ موجود نہیں ہے، کہ اس میں تینوں نظریات اور رجحانات پر مبنی تخلیقات شامل ہیں۔ اس اعتبار سے یہ مجموعہ اپنے آپ میں سب سے منفرد اور ممتاز قرار پاتا ہے۔ لہٰذا اردو شاعری کے عہد با عہد مطالعے کا ذوق رکھنے کے لئے اور خوبصورت و خوب سیرت مجموعہ غزلیات کا تین سو روپے میں حاصل کر کے اور مطالعے کے بعد اس کے مرتبین، فرزندان مظفر حنفی، فیروز مظفر اور پرویز مظفر کے ساتھ ساتھ فضیل خانم، سہیل مظفر اور عرفان مظفر کو اہتمام و التزام کے لئے نیز ان کی اکلوتی بیٹی صبا تسنیم کو تزئین کاری کے لئے دعائیں دینا ادبی ذمہ داری بھی ہے۔ ○○

قارئین کے خطوط

✉ **پروفیسر ساجدہ زیدی**......نئی دہلی

قصے کا عراق نمبر پیش نظر ہے۔ آپ کا اداریہ سچا، بیباک اور آپ کے سیاسی وتہذیبی شعور کا آئینہ دار ہے۔ امریکہ کی دہشت گردی اور دہشت پسندی، ظلم وبربریت، اور جارج بش اور ٹونی بلیئر کی فرعونیت، دھاندلی، جھوٹ، دروغ گوئی اور دوہرے معیارت کا پردہ آپ نے جس دلیری اور حق گوئی سے فاش کیا ہے اور یو۔ این۔ کی کمزوریوں اور نااہلی کو جس طرح طشت از بام کیا ہے اس کی جتنی بھی داد دی جائے اور آپ کی ہمنوائی کی جائے، کم ہے۔ میں بھی ان برسوں میں اس دہشت انگیزی کے ہر پہلو پر نظمیں لکھتی رہی اور بیان دیتی رہی۔ انگریزی صحافت میں تو ان جنگی ہتھ کنڈوں کا پردہ فاش خوب کیا گیا ہے۔ لیکن اردو ادبی رسائل نے اس پر اسقدر کھل کر نہیں لکھا ہے، جتنا آپ نے......

خصوصی مطالعے کے تقریباً تمام مضامین برمحل ہیں اور عراق پر تھوپی گئی جنگ اور اُس صدیوں پرانی تہذیب کی بربادی پر نوحہ کناں بھی ہیں اور اس کی تعبیر وتشریح سے بھی عہدہ برآں ہونے کی کامیاب کوشش ہیں، جب تہذیب کی اور ان مقدس مقبروں کی تاراجی ہوئی ہے (جیسے کربلا، نجف، بصرہ، بغداد اور سامرہ) جو ہمارے اجتماعی شعور ولاشعور میں بسے ہوئے ہیں۔ جب تاریخ دم توڑتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ جب صدیوں پرانی تہذیب کی نادر نشانیوں کو ہوسِ زر سے دیوانہ لٹیرے لوٹ رہے ہوتے ہیں تو انسان کی، اور اقوام عالم کی بے بسی......

اے عراق...... کہ عبرت خیز ہے تیرا افسانہ سب فسانوں میں...... عراق نمبر نکال کر آپ نے اردو ادب کا فرض کفایہ ادا کیا ہے۔

ادبی حصے میں کئی مشمولات معیاری، بعض نثری نظمیں رسالے میں شمولیت کے قابل بھی نہیں ہیں۔ شاعری کے انتخاب میں معیار کا زیادہ خیال رکھنا ناگزیر ہے۔ اس رسالے میں شاعری میں جو نظم حاصل شمارہ ہے وہ عشرت آفریں کی نظم ''جہاں زاد'' ...... در جواب ''حسن کوزہ گر'' (ن۔م۔راشد) ہے۔ خوب، بہت ہی خوب۔ راشد کی نظم کا جواب ہے تو شاعرانہ معیار بھی ن۔م۔راشد ہی کے بلندیٔ معیار تک پہنچا ہے۔ ان خاتون کی کچھ اور نظمیں بھی چھاپیے۔ انہیں شعر کی معنویت اور شعر کی تاثیر کا شعور ہے اور روانی کی شعریت کو پہچانتی ہیں۔ روانی اور

بے ساختگی (سادگی، پرکاری، جملہ شعری لوازمات کے ساتھ) ہمارے کم ہی نظم گویوں میں نظر آئی ہے...... میری نظم آپ نے تیسرے نمبر پر رکھی ہے۔ کوئی بات نہیں۔ بعض نثری نظم جن میں شعریت کا خانہ ہی خالی ہے اس کے بعد رکھنا ستم ہے۔ آپ کی یہ ترتیب میری سمجھ سے باہر ہے۔ تبصرے بیشتر اچھے ہیں، نفسیات اور فلسفہ سے متعلق اور بھی مضامین حاصل کرنے کی کوشش کیجئے، خصوصاً ایسے جن کا تعلق ادب سے براہ راست ہے۔ امید ہے اگلا شمارہ بھی اتنا ہی عمدہ ہوگا......!

☒ **احمد ہمیش**......کراچی (پاکستان)

بے حد شکریہ کہ آپ نے قصے کا جنوری ۲۰۰۵ء کا شمارہ ارسال فرمایا۔ ماہنامہ قصے ضخامت کے اعتبار سے سہ ماہی کا تاثر دیتا ہے۔ بلکہ نثری وشعری مشمولات بھی کسی نمائندہ سہ ماہی کے مساوی ہیں۔ آپ کے اداریہ اور خصوصی مطالعہ بابت عراق میں جرأت اظہار بہت نمایاں ہیں۔ جبکہ ''تاریخی وراثت کی پامالی'' (رابرٹ فسک، ترجمہ: نوشاد علی) میں امریکہ کو ایکسپوز کیا گیا ہے۔ روئے زمین پر امریکہ سے بڑا کوئی دہشت گرد نہیں۔ کہانی کے حصے میں ناصر بغدادی کی کہانی ''میں اور وہ دونوں'' تو متاثر کرتی ہے۔ البتہ قصے میں ''قابل مطالعہ کتابیں'' کا حصہ قابل توجہ ہے۔ تبصرہ کا حق ادا ہوا ہے۔ جناب طفیل اختر کی معرفت سہ ماہی تشکیل ۴۶-۵۰ کی اعزازی کاپی آپ کی خدمت میں ارسال کر رہا ہوں۔ براہ کرم سہ ماہی تشکیل کے ای۔ میل پر رسید سے نوازدیں......

(۲)

میں بے حد مسرور ہوں کہ آپ نے مجھے کئی عزیز حوالوں سے یادرکھا۔ قصے میں مجھے انقلابی فکر کا رنگ نظر آتا ہے، اور یہی ایک وصف ہے کہ جس سے قصے کی دستاویزی اہمیت قائم ہوگی۔ انیس صاحب! میرے ساتھ ایک عجیب متضاد رویہ برسہابرس سے جاری ہے۔ ہمارے یہاں کے ترقی پسند انقلابی فکر کو مشروط سطح پر بریکٹ کرتے ہیں۔ میری انقلابی فکر مشروط بریکٹ میں نہیں آتی۔ ترقی پسند جب یہ دیکھتے ہیں کہ احمد ہمیش خدا رسول اور آل رسول میں ایمان رکھتے ہیں تو بائیں بازو کے خانہ سے اُسے نکال دیا جاتا ہے۔ حالانکہ میں نے سہ ماہی تشکیل کے کئی گزشتہ شماروں میں سامراجی طاقتوں کے خلاف بے باکانہ لکھا ہے۔ میں نے امریکہ کے خلاف جتنا لکھا ہے، کم ہی لوگوں نے اتنا لکھا ہوگا۔ مگر ترقی پسندوں کی دانست میں میرے لکھے ہوئے کا شمار نہیں۔ گویا کیمپ دیکھا جاتا ہے۔ اگر احمد ہمیش ترقی پسند کیمپ میں نہیں تو ان کی آزاد انقلابی فکر کا شمار نہیں ہوسکتا۔ تاہم میں اپنا موقف آپ پر واضح کرتے ہوئے ہر قسم کے غیر ضروری اختلاف سے بے نیاز ہوں۔ جلد ہی آپ کی خدمت میں ایک مضمون ''افسانہ: وسعت موضوع کی لگار پر'' ارسال کروں گا۔

☒ **جوگندر پال**......نئی دہلی

آپ کا قصے ملا۔ شکرگزار ہوں۔ میں نے بڑے شوق اور انہماک سے اس کا مطالعہ کیا ہے۔

اچھے ہم عصر ادب کی باقائدہ پیشکش بڑی اہم ذمہ داری ہے۔ جسے آپ نہایت خوش اسلوبی سے نبھا رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اردو کے بعض دیگر عمدہ رسائل کے مانند آپ کا قصے بھی ہم عصر ادبی ریل پیل کو بنائے رکھنے میں بڑا سرگرم رول ادا کرے گا۔ خدا آپ کی ہمت بنائے رکھے۔

✉ **حفیظ آتش** .... امروہہ

قصے کا تازہ شمارہ عراق نمبر نظر نواز ہوا۔ آپ کا اداریہ (ایک ادارہ خواجہ سراؤں کا) تو بھائی انیس یہ خواجہ سرا ہیں، انہیں لاکھ لعن تعن کر لیجئے یہ کرتے وہی ہیں جو ان کے پروگرام ہیں۔ لیکن اس پر احتجاج بھی ضروری ہے اور اس کا اثر بھی خاطر خواہ ہوتا ہے۔ رہی بات اردو کی تو جیسے تیسے کچھ اکیڈمیوں کی بیساکھی اور کچھ آپ جیسے سر پھرے اردو شیدائیوں کی بنا پر چل رہی ہے اور غنیمت ہے کہ چل رہی ہے۔ دراصل عام آدمی کو اس سے دلچسپی برائے نام ہی رہ گئی ہے۔

قصے کے دیگر مشمولات جیسے خصوصی مطالعہ ایک اچھا سلسلہ ہے۔ جہاں تک کہانیوں کی بات ہے، ساگر سرحدی اپنی مثال آپ ہیں۔ ان کے متعلق کچھ کہنے سے پہلے مجھ جیسے کم علم کو بہت پڑھنا پڑے گا۔ وہ جس موضوع کو بھی اٹھاتے ہیں غیر معمولی بنا دیتے ہیں۔ ''درد پہچانا سا'' اس کی بہترین مثال ہے۔ طاہر نقوی کی کہانی شاید آپ نے بغیر پڑھے چھاپ دی۔ طاہر نقوی کی کہانی ''کیڑے'' پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مسلک کی بھاری زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ ورنہ کہانی کے مرکزی کردار جو مر چکا ہے، اس کا نام مولوی عمر دین نہیں رکھتے۔ اس کا نام علی حیدر یا کلب صادق یا حسنین بھی تو ہوسکتا تھا۔ مولوی عمر دین ہی کیوں......؟ چلئے آپ نے مولوی عمر دین نام دیا پھر اس کی دو قبریں کھدوائیں۔ دونوں میں سانپ بچھو اور بہت سے کیڑے بھروا دئے ...... پھر اس کی بیوی جو بہت رو پیٹ رہی تھی، مولوی عمر دین کے کمینہ ہونے کا یہ انکشاف کرتی ہے کہ یہ دیکھنے کا مولوی تھا، اس کمینے نے اپنی جوان لڑکی تک کو نہیں بخشا، اس سے اس کی قبر میں کیڑے پڑے...... یار، یہ ذہنی دیوالیہ پن نہیں تو اور کیا ہے......؟ یہ کہانی کے بہانے طبرہ لکھ رہے ہیں۔ ناصر بغدادی اور بشیر صاحب کی کہانیاں ٹھیک ٹھاک ہیں۔ ''قیدی کی واپسی'' عراقی کہانی وطن پرستی کے جذبے سے سرشار ہے مگر مقدس رشتوں کی اذیت ناک بے حرمتی بھی ہے۔ دو زاویے کے کالم میں آپ نے کمال کر دیا۔ ن۔ م۔ راشد کی نظم ''حسن کوزہ گر'' جہاں بہت اچھی نظم ہے، اور شہرت کی تمام بلندیوں کو پار کر چکی ہے، وہیں ''جہاں زاد'' عشرت آفرین کی نظم کا ہر مصرعہ معنی کے خزانے لئے ہوئے ہے۔ نظم پڑھ کر حیرت ہوئی کہ میں نے اب تک عشرت آفرین کو کہیں کیوں نہیں پڑھا۔ عشرت آفرین کو اتنی خوبصورت تخلیق پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ نصیر احمد ناصر نظم گو شعراء میں اپنا ایک علیحدہ مقام رکھتے ہیں۔ ساجدہ زیدی کو پڑھتے وقت مجھے ہمیشہ ایسا لگتا ہے جیسے نظم وہ نہیں کہتیں بلکہ نظم ان کو کہتی ہے۔ ایسے رواں دواں مصرعے کہ زبان زد ہو جائیں اور ایک ایسی کیفیت نظم کے اندرون میں ہوتی ہے جیسے تپتی دوپہر میں اچانک کہیں سے کوئی سیاہ بادل کا ٹکڑا دور تک ساونی پھیلا دے۔ ادھر آپ کی نظمیں ان بھیانک اور

دل سوز منزلوں کی وہ تصویر پیش کرتی ہیں جنہیں پڑھ کر کلیجہ منہ کو آجائے۔ غزلوں میں طالب رامپوری، عالم خورشید، شکیل اعظمی، راشد طراز، نور منیری، مظفر حنفی، نشتر خانقاہی، پرکاش فکری، علقمہ شبلی متوجہ کرتے ہیں۔ خطوط کے کالم میں جلیل الرحمٰن بجنوری صاحب کا خط پڑھنے اور سمجھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ تاریخ سے لے کر عصری مسائل تک کی بات انہوں نے اپنے خط میں بڑے سلیقے سے کہی ہے۔ قصے کے تعلق سے آخر میں ایک درخواست یہ ہے کہ آپ ترتیب کا خیال رکھیں۔ سینئر بہرحال سینئر ہوتے ہیں۔

نریندر سیٹھ ....نئی دہلی

لگ بھگ دو سال کے بعد اچانک قصے کا تازہ شمارہ نمبرے ملا۔ دراصل دو برس پہلے میں سولن میں تھا اور وہاں مجھے رسالہ باقاعدگی سے مل رہا تھا۔ بوجہ خرابی صحت اور خانگی پریشانی کے مجھے دہلی میں منتقل ہونا پڑا۔ حال ہی میں ۷ر دسمبر کو میرا بائی پاس آپریشن ہوا ہے اور میں صحت یابی کے لئے زیادہ تر بستر پر ہی پڑا رہتا ہوں۔ وقت گزارنا بڑا مشکل ہوتا تھا۔ لہٰذا ادھر میں نے ''آج کل'' منگوانا شروع کر دیا۔ انگریزی کا ''انڈیا ٹوڈے'' اور ''ریڈرز ڈائجسٹ'' بھی آتا ہے۔ اب قصے کے ملنے سے پڑھنے کے لئے اچھا خاصہ مٹیریل ہو جائے گا۔ حالانکہ مہینے بھر کے لئے کافی نہیں۔ تاہم روز بروز کے حالات جاننے اور ادبی مطالعے سے دل تو بہلے گا ہی۔

قصے کے عراق نمبر پر بڑی گہری نظر دوڑائی اور آپ کو مبارکباد دینے کا دل چاہا۔ سو یہ خط لکھنے بیٹھ گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ امریکہ کا عراق پر جارحانہ حملہ اقوام متحدہ کے منہ پر زبردست طمانچہ ہے اور اس ادارے میں شامل دو سو سے زیادہ ممالک کو اس پر خوب غور وخوض کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ ادارہ یقینی طور پر امریکہ کی زرخرید اجارہ داری کا حصہ بن چکا ہے۔ افسوس کی بات یہ بھی ہے کہ امریکی عوام نے ظالم بش کو دوسری بار کیوں چن لیا۔ شاید اس کے مقابلے میں ڈیموکریٹ پارٹی کا نمائندہ زیادہ طاقتور نہیں تھا یا وہ منجھا ہوا سیاستداں نہیں تھا کہ بش کی عراق پالیسی کا توڑ پیش کر سکتا تھا۔ بہرحال امریکہ بڑا ڈھیٹ ملک ہے۔ اس نے کوریا اور ویتنام کی لڑائیوں سے کوئی سبق نہیں لیا۔ دراصل عراقی فوج یا عوام ویت نام کے گوریلا لڑاکوؤں کی طرح امریکہ کی فوج کا مقابلہ کرنے کے اہل نہیں تھے۔ صدام تاناشاہ تھا، مانا......لیکن اس کی فوج بالکل نکمی ثابت ہوئی۔ اب بھی اگر عراق کی باقی ماندہ فوج گوریلا لڑائی لڑ سکے تو امریکی فوج دم دبا کر بھاگتی نظر آئے گی۔ کیوں کہ جوں جوں گرمی بڑھتی جائے گی، یہ سفید چمڑی کے نام نہاد لڑا کو مقابلہ کرنے کے قابل نہیں رہیں گے۔ اس میں عراقی عوام کو اپنا کردین چھوڑ کر باقی عرب ممالک کی گوریلا فوج سے مدد لینی چاہئے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ آج امریکہ بذات خود سب سے بڑا دہشت گرد ملک ہے۔ کیوں کہ اس کے پاس اپنی دفاع کے سارے ذرائع ہیں اور ساتھ ہی برطانیہ جیسے دم چھلے بھی اس کی پشت پر ہیں۔ آخر نسل تو ایک ہی ہے۔ برطانیہ کا اپنا وجود تو ختم ہونے کو ہے۔ اس کے شاہی خاندان کے بخئے تو اس کی اپنی نسل ہی ادھیڑ رہی ہے۔ ڈائنا کی موت سے لے کر آج تک جو کچھ ہوا ہے اس سے شاہی خاندان کمزور ہی پڑا ہے، اور وہ دن دور نہیں

جب برطانیہ کے عوام اس سے بالکل بدظن ہو جائیں گے۔
ویتنام کے ساتھ لڑائی کے وقت ایک دفع اخبار میں ایک امریکی نیگرو سپاہی کو میدان جنگ میں بندوق کے سہارے اونگھتے فوٹو دیکھا تھا اور اک آزاد نظم ویتنام میں امریکی سپاہی لکھنے کی کوشش کی تھی، پیش خدمت ہے۔ وہی حال عراق میں ہو رہا ہے۔
انیس بھائی، میں ایک پینشن شدہ ستر سالہ عمر رسیدہ آدمی ہوں۔ پنشن بھی قلیل ہے۔ مہنگائی کا زمانہ ہے۔ اوپر سے بیماری، دوا دارو کا خرچہ ہی بہت ہے جو برداشت سے باہر ہے۔ تاہم قصے کے لئے زر سالانہ ضرور بھیجوں گا۔ لیکن اگلے ماہ۔ اگر یہ رقم بذریعہ چیک بھیج دوں تو آپ کو عذر نہیں ہوگا کیوں کہ ابھی میں اس حالت میں نہیں کہ چل کر پوسٹ آفس تک جا کر منی آرڈر کر سکوں۔ آپ مجھے میرے موبائل پر اطلاع دے سکتے ہیں۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ امرتا پریتم کی کتاب ''ایک تھی سارا'' (سارا شگفتہ) کا زندگی نامہ دہلی میں کس دکان پر مل سکتی ہے؟ سارا شگفتہ سے، جب وہ پہلی اور آخری بار ہندوستان آئی تھی، ملاقات ہوئی تھی اور ایک محفل بھی سجائی تھی۔ بے حد بیباک و نڈر قسم کی شاعرہ تھی۔

✉ ڈاکٹر نگار عظیم .... نئی دہلی

طویل خاموشی کے بعد قصے موصول ہوا تو خوشی ہوئی۔ یہ وہم ہونے لگا تھا کہ قصے کہیں قصہ پارینہ نہ بن جائے۔ بہر حال اطمنان ہوا۔ ''ایک ادارہ خواجہ سراؤں کا'' میں جرأت اظہار کی صاف گوئی نے متاثر کیا۔ عراق نمبر کا ''خصوصی مطالعہ'' پڑھ کر وہ زخم جو مندمل نہ ہوئے تھے، ٹیس کرنے لگے۔ زہر تو پینا ہی پڑے گا۔ تلخ حقیقتیں ہیں، صدیوں پرانا تاریخی، تہذیبی ورثہ لٹنے کا درد وغم ہر ذی ہوش انسان کو متاثر کرے گا۔ افسانوی حصہ پسند آیا، خاص طور پر ''قیدی کی واپسی'' نے روح کو جھنجوڑ دیا۔ مظفر حنفی، اختر شاہجہانپوری، سعد اللہ شاہ اور خسرو متین کی غزلوں نے دل کے تاروں کو چھوا ہے۔ احساسات کے سمندر میں ڈوبتی کچھ نظمیں بھی بے انتہا پسند آئیں، جن میں لکشمن ریکھا، صرف انسان، شب گزیدہ، آزادی کے نام پر، خاص طور سے شامل ہیں۔ آپ کو تو میری مصروفیت کا اندازہ ہے، اگلے شمارے کے آنے تک پچھلے شمارے کا مطالعہ جاری رہتا ہے۔ خدا آپ کو کامیابی عطا کرے، اپنی کوششیں جاری رکھئے۔ دو غزلیں بھیج رہی ہوں، ممکن ہو تو جگہ دیجئے گا۔

✉ پرکاش چندر .... نئی دہلی

قصے کا ساتواں شمارہ ملا۔ چونکہ شمارہ چھ اور سات میں بہت وقفہ تھا، اس لئے بھی زیادہ مزا دے گیا۔ آپ کا اداریہ حسب معمول خوب تھا۔ عراق نمبر میں صرف پانچ مضامین تشنگی کا تاثر چھوڑ گئے اور پھر ان میں سے تین تو تراجم تھے۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ اردو کے تخلیق کاروں نے بہت کم لکھا ہے؟ کیا بے حسی ہے؟ فسک کا مضمون کس زبان سے لیا گیا ہے اور ان کی تحریف کیا ہے؟ عراقی نظمیں نہایت دل سوز ہیں۔ مجتبیٰ حسین کی کتاب پر تبصرہ، زمین کا نوحہ، سفرنامے اور نارنگ کی غزل پر کتاب کافی سے زیادہ پرانی ہیں۔ باقی کتابوں کے بارے میں، میں جانتا نہیں۔ بادبان اور مکالمہ پر تبصرے

کا کیا جواز ہے؟ قصے کی مانند اور بھی اچھے رسائل کراچی سے شائع ہوتے ہیں مثلاً روشنائی اور آصف فرخی کا جریدہ (نام یاد نہیں آرہا۔) غزل اور نظم کی تعداد (قریباً ۴۰) کم ہونی چاہئے کیوں کہ آپ کے جریدہ میں بھرتی کا کوئی مضمون یا ان دونوں اصناف کی مثالیں زیبا نہیں دیتیں اور پھر نظم اور غزل جس کثرت سے لکھی جارہی ہیں، وہ سب معیاری تو نہیں ہوتیں؟ محض لفظی ہیر پھیر۔ ردیف اور قافیے کا ضابطہ اچھی تخلیق نہیں بن جاتا نہ کوئی جدت خیال نہ نیا استعارہ یا نئی بات کی جاتی ہے۔ اگر کوئی ذاتی مصلحت یا تکلف ہے تو ہوتا رہے۔ مگر یہ میری حقیر رائے ہے جو مجھے پرزور طریقے سے کہنی ہے۔

آج کل انگریزی الفاظ کثرت سے استعمال ہو رہے ہیں۔ یا تو ان کے متبادل اردو الفاظ استعمال ہوں اور انگریزی الفاظ بریکٹ میں یا انگریزی الفاظ کا مفہوم اردو میں بھی ہونا چاہئے۔ میرے خیال میں اردو کے قاری بھی انگریزی تو نہیں جانتے۔ یہ مسئلہ میں نے وزیر آغا اور شمس الرحمٰن فاروقی سے بھی اٹھایا ہے۔ ضخامت کے بارے میں میری درخواست یہ ہے کہ سہ ماہی رسائل ۱۶۰ ریا ۱۵۰ صفحات تک ہی محدود ہوں تو بہتر ہے، نہیں تو رسالہ کتاب بن جاتا ہے۔ امید ہے میرے معروضات قصے-۸ میں شامل ہوں گے۔

☒ ڈاکٹر سید علی مهدی نقوی خیال امروھوی .... پاکستان

قصے عراق نمبر موصول ہوا۔ التفات اور قدر دانی کا شکریہ۔ یوں تو قصے کے تمام مضامین لایق مطالعہ ہیں لیکن گزشتہ شب ''کیڑے'' کے عنوان سے جو کہانی پڑھی، تو تمام رات نیند نہیں آئی۔ اگر یہ واقعہ حقیقت ہے۔ سفرنامہ پاکستان بھی پڑھا۔ امروہہ نہایت مردم خیز ضلع ہے ادب کی حد تک، بصورت دیگر امروہہ کے لوگ کچھ عجیب وغریب خلقت سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں حیدرآباد دکن میں پیدا ہوا، وہیں پلا بڑھا، میرے والد مرحوم امروہہ سے ہجرت کر کے دکن آگئے تھے۔ میرے پھوپی زاد بھائی مرحوم رئیس امروہوی، ان کے بھائی سید محمد تقی فلسفی، جون ایلیا، عباس وغیرہ یہ سب امروہہ کی پیداوار ہیں اور سب نامور اور عظیم قدر ومنزلت کے حامل۔ میرے ایک اور پھوپی زاد بھائی سید منور سعیدٹی۔ وی آرٹسٹ لاہور میں ہیں۔ شہناز منور سعید میری بھتیجی ہیں۔ اپنے والد سید محمد تقی کی قدرداں اور علمی حلقوں میں نہایت قدر ومنزلت کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں۔ کمال امروہوی کو دیکھئے، کس قدر شہرت پائی۔ میرے اپنے والد کے عزت واحترام کی وجہ سے امروہوی لکھنا سعادت تصور کرتا ہوں۔ وگرنہ میں نے امروہہ دیکھا نہیں۔ والد کہتے تھے مجھے سال دو سال کی عمر میں جد امجد، حضرت شاہ شرف الدین شاہ ولایت کے مزار پر دکن سے یو۔ پی ہاشتی فقیر مرشد بنا کر لے گئے تھے۔ اب مجھے کیا یاد کہ امروہہ کیسا تھا اور اب کیا ہے۔ حضرت انیس امروہوی، مدیر قصے، آپ تو امروہے کے بالکل قریب دہلی میں ہیں۔ قصے واقعی بڑا وقیع جریدہ ہے، اس کے لئے کچھ نہ کچھ لکھوں گا۔ اپنے ملک کے ہی جرائد سے فرصت نہیں ملتی۔

نوٹ: منور سعید اور ان کی بیگم شہناز گزشتہ دنوں امروہہ گئے تھے۔ حضرت شاہ ولایت (جن کی

ہم اولاد ہیں، بحوالہ تاریخ امروہہ) ان بزرگوار کے مزار پر کثرت سے بچھو پائے جاتے ہیں جو صرف مزار کے حصار میں ڈنک نہیں مارتے۔ چنانچہ شہناز نے ایک بچھو ہتھیلی پر اٹھا کر رکھا، اس کی تصویر لاہور لائے تھے۔ کچھ بزرگ ایسے بھی تھے جن کے معجزات و کرامات میں حشرات العرض شامل ہوئے۔ ایک ہمارا ملک جہاں کے انسان خزندوں سے بھی گئے گزرے، لیکن قصے میں ''کیڑے'' کہانی پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ کیا واقعی ایسا ہی ہوا؟

✉ ولی محمد چودھری .... امروہہ

ڈیئر انیس...... طویل انتظار کے بعد قصے کا عراق نمبر موصول ہوا۔ پرچہ دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ سرورق خوبصورت اور گٹ اپ بھی شاندار ہے۔ ''ایک ادارہ خواجہ سراؤں کا'' کے عنوان سے اداریہ پسند آیا۔ لکھا بھی محنت سے ہے۔ U.N.O. اب اپنی افادیت کھو چکا ہے۔ یہ ادارہ امریکہ کی جیب میں ہے۔ وہ جیسے چاہے اس کا استعمال کرتا ہے۔ راج کشور، اعجاز احمد اور عشرت آرا کے مضامین، امریکی دادا گیری اور درندگی کے خلاف احتجاج بھی ہیں اور ساری دنیا کے لئے لمحہ فکریہ بھی۔ پریم شنکر جھا کا آنکھوں دیکھا حال اور رابرٹ فسک کا مضمون دل دہلا دیتے ہیں۔ یوں تو امریکیوں نے جو کہ تہذیب یافتہ ہونے کا ڈھونگ کرتے ہیں، منگولوں کی درندگی اور بربریت کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ دو زاویے میں دونوں نظمیں ن۔ م۔ راشد کی بھی اور عشرت آفریں کی بھی، تخلیق کا شاندار نمونہ ہیں۔ نظم کا حصہ ٹھیک ٹھاک ہے۔ نصیر احمد ناصر، ساجدہ زیدی اور حفیظ آتش تو نظم کے اچھے شاعر ہیں ہی، ادھر نعمان شوق کی نظمیں بھی اپنی طرف متوجہ کرنے لگی ہیں۔ ''Lap Dog کی حمایت میں'' نعمان کی ایک عمدہ نظم ہے۔ غزل کے حصے کو انتخاب کی ضرورت ہے۔ افسانوں میں ناصر بغدادی جیسے ذہین فنکار کی کہانی ''میں اور وہ دونوں'' مایوس کرتی ہے، ایک دم سپاٹ۔ ساگر سرحدی کی کہانی ''درد پہچانا سا'' اچھی کہانی ہے۔ طاہر نقوی کی کہانی ''کیڑے'' قابل مذمت ہے جو کہ طاہر نقوی کے ذہنی دیوالیہ پن کا پتہ دیتی ہے۔ طاہر نقوی جیسے نام نہاد ادیبوں اور شاعروں کی وجہ سے پاکستان کی رگوں میں شیعہ سنی فرقہ واریت کا زہر بھر چکا ہے۔ اسی لئے وہاں سنی شیعہ نمازیوں پر اور شیعہ سنی نمازیوں پر مسجدوں میں گولیاں برساتے اور گولے داغتے ہیں۔ طاہر نقوی کی کہانی شاید تم نے بغیر پڑھے ہی شائع کر دی۔ ایسی لایعنی اور طبرائی کہانیوں کی ہندوستان میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ عراقی کہانی ''قیدی کی واپسی'' شاندار کہانی ہے۔ جن ملکوں کے مردوں کی روایت جنگ میں فاتح یا شہید کی رہی ہو، ان ملکوں کے بچے بھی اپنے بڑوں سے فاتح یا شہید ہونے کی توقع رکھتے ہیں اور بیچ کا کوئی راستہ پسند نہیں کرتے۔

✉ قاضی جاوید .... اکادمی ادبیات (پاکستان)

میرے محترم...... سلام و آداب!! قصے کو آپ نے بجا طور پر ''مثبت تخلیقی رویوں کا عکاس'' قرار دے رکھا ہے۔ مجھ کو اس کا جنوری ۲۰۰۵ء کا شمارہ پڑھنے کا موقع ملا جو آپ نے ان عراقیوں کے نام کیا ہے جو غیر ملکی جارحیت کے آگے گھٹنے ٹیکنے سے منکر ہیں۔

بھارت کے اردو ادبی رسائل یہاں لاہور میں پڑھنے والوں کو کم ہی نصیب ہوتے ہیں۔ اس لئے آپ کا جریدہ ملنے پر زیادہ ہی خوشی ہوئی اور خوشی اس میں شامل مختلف کتب اور جرائد کے اشتہار پڑھ کر بھی ہوئی۔ واقعی، دیکھئے کہ بھارت کے مختلف اداروں اور ادیبوں کی طرف سے کیسے کیسے اہم اور عمدہ موضوعات پر کتابیں شائع ہو رہی ہیں۔ ساہتیہ اکیڈمی اور دہلی اردو اکیڈمی کے اشتہار نے تو ذہنی اشتہا بہت بڑھا دی۔ سوچتا ہوں کہ ڈاکٹر دھرمیندر ناتھ، گوپی چند نارنگ اور مناظر عاشق ہرگانوی جیسے مصنفین کی کتابیں کب پاکستان پہنچیں گی اور ہم لوگ حاصل کر سکیں گے۔

اچھا، ایک بات کہنے دیجئے، مجھ کو آپ کے جنوری شمارہ کے اداریہ کا عنوان ''ایک ادارہ خواجہ سراؤں کا'' اچھا نہیں لگا۔ اول تو یہ جمالیاتی احساس کو ٹھیس پہنچاتا ہے اور دوسری بات، امروہوی صاحب یہ کہ اقوام متحدہ وہی کچھ ہے جو کہ اقوام عالم اس کو بنانا چاہتی ہیں۔ وہ موجودہ عالمی نظام کا حصہ ہے اور حکومتوں کا نمائندہ ہے۔ آپ اس سے باغیوں کے طرز عمل کی توقع نہیں کر سکتے۔

یہ بھی دیکھئے کہ دنیا کے انتہا پسند اقوام متحدہ سے غیر مطمئن ہیں۔ آپ بھولے نہ ہوں گے کہ آر۔ ایس۔ ایس کے کے۔ ایس۔ سدرشن صاحب اس عالمی ادارے کو کیسے بُرا بھلا کہتے رہتے ہیں۔

جنوری کی تحریروں میں سے راج کشور، نعمان شوق، عین تابش، عقیل گیاوی، پی۔ پی۔ شریواستو رند، ساجدہ زیدی اور پرکاش فکری کی نگارشات زیادہ اچھی لگی ہیں۔ گوپی چند نارنگ صاحب کی کتاب ''اردو غزل اور ہندوستانی ذہن و تہذیب'' اپنے موضوع کے لحاظ سے بہت اہم لگتی ہے، مگر آپ نے جو تبصرہ شامل کیا ہے، اس میں شاید کتاب کے زیادہ لطیف فکری گوشوں کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

✉ ڈاکٹر فاروق احمد صدیقی ....مظفر پور (بہار)

قصے شمارہ-۷، عراق نمبر ایک عزیز کے توسط سے پڑھنے کو ملا۔ جی خوش ہو گیا۔ بہت عمدہ رسالہ نکالا ہے آپ نے۔ مبارکباد...... آپ کا اداریہ بہت ہی گراں قدر اور فکر انگیز ہے۔ آپ نے وقت کے سلگتے ہوئے مسائل کی طرف اہل اردو کی توجہ بڑی دل سوزی کے ساتھ مبذول کرائی ہے۔ آپ کے اداریہ کی سطر سطر سے خلوص و محبت کی مہک آ رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ اردو زبان و ادب کے تعلق سے آپ کے والہانہ جذبات کو سلامت رکھے...... آمین! ''عراق نمبر'' میں تمام مضمون نگاروں نے اپنے اپنے طور پر وہاں کی بڑی درد انگیز تصویریں پیش کی ہیں۔ ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے نتیجے میں دہلی کی تباہی و بربادی کے تناظر میں مولانا حالی نے کہا تھا......

تذکرۂ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سنا جائے گا ہرگز یہ فسانہ ہم سے

پہلے مصرعے میں ہلکی سی ترمیم کر کے میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ...... ''تذکرہ کشور عراق کا اے......''۔ پیش نظر شمارے میں طاہر نقوی کی کہانی ''کیڑے'' بڑی ہی عبرتناک ہے۔ خورشید مصطفیٰ رضوی کا مضمون ''ہمدم دیرینہ: نثار احمد فاروقی'' بہت ہی خوب ہے۔ فاروقی صاحب مرحوم اپنے

گرانقدر علمی، تحقیقی کارناموں کی بدولت تاریخ ادب اردو کا ایک اہم حصہ بن گئے ہیں۔ ان کو فراموش کر دینا آسان نہیں ہوگا۔ بازگشت کے تحت جناب خلیل الرحمٰن خاں (بجنور) کا مفصل و معقول مکتوب بہت ہی اہم اور قابل مطالعہ ہے۔ میں ان کی اکثر باتوں سے بالکل متفق ہوں۔ خدا کرے قصے کا آئندہ شمارہ جلد ہی سُرمۂ بینش بنے۔

☒ تفضیل احمد .... موتیہاری (بہار)

آپ رسالے کے انتظار میں تھکا دیتے ہیں۔ خیر، ایک فائدہ ہوا کہ قصے-۷ کی چند چیزیں دو دو دفعہ مطالعے میں رہیں، مثلاً ''سائنس سے پرے''، ''سفر کہانی'' اور ''ہمدم دیرینہ...... نثار احمد فاروقی''۔ ان مضامین کے لئے قاری کا شکریہ قبول فرمائیں۔ غزلیں بھی بہت سی اور بہت خوب ہیں۔ ''دوزاویے'' میں عشرت آفریں زیادہ تاثر خیز ہیں۔ کہانی ''قیدی کی واپسی'' کو ''آج'' میں پڑھ چکا تھا۔ لہٰذا قند مکرر کا لطف رہا۔ براہ کرم رسالے میں ششماہی ہونے کا اعلان فرمائیں یا پابندئ وقت پر توجہ دیں، جو بہتر ہو۔

☒ فرحت سپنا .... میرپور خاص (پاکستان)

امتحانات میں مصروف تھی، اس لئے قصے-۶ کی رسید نہ بھیج سکی تھی۔ اب قصے-۷ موصول ہوا ہے۔ بہت بہت نوازش کہ آپ یاد رکھتے ہیں۔ انشا اللہ دونوں شماروں پر تبصرہ ''پہچان'' کے اگلے شمارے میں آجائے گا۔ ''ادبی چوپال'' کے تمام دوست سلام لکھواتے ہیں۔

☒ طاہر نقوی .... کراچی (پاکستان)

میرے ایک کرم فرما جناب رئیس فجمی نے قصے کا ساتواں شمارہ جنوری ۲۰۰۵ء بھجوایا۔ ان کا شکر گزار ہوں اور ساتھ ہی ساتھ آپ کا بھی۔ آپ نے اس شمارے میں میرا افسانہ ''کیڑے'' شامل کیا ہے۔ طویل مدت ہوئی آپ کو دو افسانے ''وہ جو اجنبی تھا'' اور ''کیڑے'' بھجوائے تھے۔ اس دوران آپ کے پرچے کا کوئی شمارہ شائع نہیں ہوا تھا۔ یہ بھی گمان رہا کہ بند نہ ہو گیا ہو۔ کیوں کہ اکثر ادبی پرچوں کا حال ایسا ہی ہے۔ البتہ زیر نظر شمارہ دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی۔ آپ سے عرض ہے کہ میرا افسانہ ''وہ جو اجنبی تھا'' بھی کسی قریبی اشاعت میں شامل کیجئے۔ تاہم ایک اور افسانہ بھی بھیج رہا ہوں، تاکہ قصے جیسے ادبی پرچے میں اب میری غیر حاضری زیادہ عرصہ نہ رہے۔

تازہ شمارہ جنوری ۲۰۰۵ء (ممکن ہے اس کے بعد بھی کوئی شمارہ آچکا ہو) میں نے مکمل پڑھ لیا ہے۔ عراق کے خلاف امریکی پالیسی پر جو نقطہ نظر آپ نے اپنایا ہے وہ فطری ہے، اور بر وقت بھی۔ اس شمارے کے تمام مندرجات معیاری ہیں اور فکر کے دَر وا کرتے ہیں۔ اس میں چھپ کر تمام ادیبوں کو بجا طور پر آسودگی ملتی ہوگی۔ میرے افسانوں کا چوتھا مجموعہ بہت جلد شائع ہونے والا ہے۔ اس کا اشتہار منسلک کر رہا ہوں۔ اگر ممکن ہو تو اسے جگہ دیجئے۔

☒ عبدالاحد ساز .... بمبئی

قصے کے عراق نمبر کے ساتھ آپ کی یاد آوری نے طمانیت بخشی۔ ایک عرصہ کے بعد قصے کا شمارہ پاکر خوشی بھی ہوئی۔ ابھی تو صرف آپ کا اداریہ پڑھا ہے۔ جس میں بغیر لاگ لپیٹ کے آپ نے برمحل اور بانکتہ باتیں کہہ دی ہیں۔ امریکہ، عراق کے تعلق سے تو بہت کچھ اور کچھ اردو، اداروں اور اصحاب کے تعلق سے بھی۔ ابھی تو خصوصی مطالعہ اور دیگر تمام مضامین و مشمولات غور سے پڑھنے کے لئے ہیں۔ رسالہ آپ کا خوش معیار ہی ہوتا ہے۔ ہاں میرا خیال ہے غزلوں کا حصہ کچھ زیادہ کسا ہوا ہونا چاہئے، نظمیں بیشتر اچھی ہی ہیں۔ میں نے آپ کو اپنی دوسری شعری تصنیف ''سرگوشیاں زمانوں کی'' ارسال کی تھی۔ بشرف مطالعہ بھی اور قصے میں تبصرے کے لئے بھی۔ اس کو کافی عرصہ ہوگیا۔ اس اثنا میں کوئی شمارہ شاید آیا بھی نہیں۔ متوقع تھا کہ اس شمارے میں اس پر تبصرہ آجائے گا۔ بہرحال اس پر ایک مختصر اور متوازی سا تبصرہ آئندہ شمارے میں شامل کردیں۔

☒ ڈاکٹر عطا الرحمن عطا .... آرا (بہار، بھارت)

قصے ۔ے عراق نمبر موصول ہوا۔ شکریہ۔ قصے ۔ے مطالعے سے گزرا۔ یوں تو تمام مضامین محنت سے لکھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں لیکن بالخصوص شمیم حنفی، راج کشور، عشرت آرا اور اعجاز احمد کے مضامین پسند آئے۔ دو غزلیں قصے کے لئے بھجوار ہا ہوں۔ امید ہے کہ پسند فرمائیں گے اور انہیں شائع کرکے شکریہ کا مزید موقع دیں گے۔

☒ کلیم نشتر .... ابلاغ پبلی کیشنز، لاہور۔

برادرم طفیل اختر نے قصے کے کئی شمارے عطا کئے۔ یہ مختصر سا خط ایک طرح سے اس کی رسید سمجھئے۔ قصے کو جب بھی دیکھتا ہوں، آپ کے خطے کے صحافی شاعر محشر عنایتی صاحب کا ایک پرانا شعر میرے ذہن میں گونجنے لگتا ہے، جو زمانہ طالب علمی سے میرے تعاقب میں ہے......

تمام احتیاطِ محبت کو سامنے رکھ کر
انہوں نے قصے سنے، میں نے واقعات کہے

سو، پڑھنے والے قصے کے ذریعے واقعات و حوادث کا چہرہ دیکھتے اور آپ کی جرأت رندانہ اور طرز نگارش و اسلوب کی داد دیتے ہیں۔ ماحول اور معاشرہ کے تلخ و ترش مسائل کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ شعر و ادب کی چاشنی نے قصے کو بے حد نمائندہ حیثیت دی ہے۔ ترتیب و تدوین اور نظم و نثر کے معیاری مضامین کے انتخاب نے قصے کو بے حد وقیع جریدہ بنا دیا ہے اور یہ سب آپ کا ادارتی کمال ہے۔ ایک خالص سیاسی، سماجی یا ادبی جریدے کو اتنا ہلکا پھلکا عوامی رسالہ محض آپ کے اسلوب نے بنایا ہے...... مبارکباد قبول فرمائیے!

OO

اردو کی بقا و فروغ کے لیے اردو کتب و رسائل خرید کر پڑھنے کی عادت ڈالیے۔

کتب موصولہ

پھول جیسے لوگ (ناول)
☆مصنف:انور خان ☆ ۲۰۰۵ء ☆صفحات: ۱۵۲ ☆ایک سو بیس روپے ☆ناشر: تخلیق کار پبلشرز، لکشمی نگر، دہلی-۱۱۰۰۹۲

جوش ملیح آبادی: خصوصی مطالعہ (انتخابِ مضامین)
☆مرتب: ڈاکٹر قمر رئیس ☆ ۲۰۰۵ء ☆صفحات: ۳۵۲ ☆دو سو روپے ☆ناشر: تخلیق کار پبلشرز، لکشمی نگر، دہلی-۱۱۰۰۹۲

انتخاب کلیات ن۔ م۔ راشد (شاعری)
☆مرتب: مرغوب علی ☆ ۲۰۰۵ء ☆صفحات: ۲۲۴ ☆ایک سو اسی روپے ☆ناشر: تخلیق کار پبلشرز، لکشمی نگر، دہلی-۱۱۰۰۹۲

گلدستہ بیت بازی (انتخاب)
☆مرتب: ڈاکٹر شجاع الدین فاروقی ☆ ۲۰۰۴ء ☆صفحات: ۳۰۴ ☆دو سو روپے ☆ناشر: تخلیق کار پبلشرز، لکشمی نگر، دہلی-۱۱۰۰۹۲

فساد (ناول)
☆مصنف: مہرالدین خاں ☆ ۲۰۰۴ء ☆صفحات: ۱۱۲ ☆سو روپے ☆ناشر: تخلیق کار پبلشرز، لکشمی نگر، دہلی-۱۱۰۰۹۲

فراق: مطالعہ، محاسبہ (تنقید)
☆مرتب: ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی ☆ ۲۰۰۴ء ☆صفحات: ۱۷۶ ☆ایک سو بیس روپے ☆ناشر: تخلیق کار پبلشرز، لکشمی نگر، دہلی-۱۱۰۰۹۲

نثری بیانیہ (مضامین)
☆مصنف: ڈاکٹر مجید بیدار ☆ ۲۰۰۵ء ☆صفحات: ۱۶۰ ☆ایک سو پچاس روپے ☆ناشر: تخلیق کار پبلشرز، لکشمی نگر، دہلی-۱۱۰۰۹۲

درد کا رشتہ (افسانے)
☆مصنف: راشد سہوانی ☆ مرتب: خرم جاوید ☆ ۲۰۰۵ء ☆صفحات: ۲۲۴ ☆دو سو روپے ☆ناشر: تخلیق کار پبلشرز، لکشمی نگر، دہلی-۱۱۰۰۹۲

عورت زندگی کا زنداں (مضامین)
☆مصنفہ: زاہدہ حنا ☆ ۲۰۰۴ء ☆صفحات: ۳۰۴ ☆دو سو روپے ☆ناشر: شہرزاد، بی-۱۵۵، بلاک-۵، گلشن اقبال، کراچی (پاکستان)

تنقیحات (مضامین)
☆مصنفہ: ڈاکٹر نیر جہاں ☆ ۲۰۰۵ ☆صفحات: ۱۷۶ ☆ایک سو بیس روپے ☆ناشر: تخلیق کار پبلشرز، لکشمی نگر، دہلی-۱۱۰۰۹۲

مضامین ہفت رنگ (مضامین)
☆مصنف: محبوب الرحمٰن فاروقی ☆ ۲۰۰۵ء

☆صفحات: ۲۳۲ ☆ دو سو روپے ☆ ناشر: تخلیق کار پبلشرز، لکشمی نگر، دہلی-۱۱۰۰۹۲

📖 **جوگندر پال کی کہانیاں** (افسانے)

☆ مصنف: جوگندر پال ☆ ۲۰۰۵ء ☆ صفحات: ۲۷۲ ☆ ایک سو اسّی روپے ☆ ناشر: تخلیق کار پبلشرز، لکشمی نگر، دہلی-۱۱۰۰۹۲

📖 **شعلوں کے درمیان** (شاعری)

☆ شاعرہ: بلقیس ظفیر الحسن ☆ ۲۰۰۴ء ☆ صفحات: ۱۶۰ ☆ سو روپے ☆ ناشر: معیار پبلی کیشنز، کے-۳۰۲، تاج انکلیو، گیتا کالونی، دہلی-۱۱۰۰۳۲

📖 **شعلۂ تر** (شاعری)

☆ شاعر: نور محمد نور ☆ سن ندارد ☆ صفحات: ۱۴۴ ☆ سو روپے ☆ ناشر: حضرت نور اکیلوی یادگار سوسائٹی، ۳۸۹-۴-۱۶، چنچل گوڑہ، حیدرآباد۔

📖 **روشنی جلتی ہوئی** (شاعری)

☆ شاعر: غالب عرفان ☆ ۲۰۰۲ء ☆ صفحات: ۲۰۸ ☆ دو سو روپے ☆ ناشر: بزم تخلیق ادب پاکستان، پوسٹ بکس نمبر-۱۷۶۷، کراچی-۷۵۳۰۰

📖 **موج نقد** (مضامین)

☆ مصنف: پروفیسر مرزا محمد زماں آزردہ ☆ ۲۰۰۴ء ☆ صفحات: ۲۵۴ ☆ دو سو پچاس روپے ☆ ناشر: مرزا پبلی کیشنز، شری نگر

📖 **پسندیدہ افسانے** (انتخاب)

☆ مرتب: طفیل اختر ☆ ۲۰۰۳ء ☆ صفحات: ۱۶۲ ☆ ایک سو پچیس روپے ☆ ناشر: پرائم ٹائم پبلی کیشنز، ماڈل ٹاؤن، لاہور (پاکستان)

📖 **شہر افسانہ** (افسانے)

☆ مصنف: منشا یاد ☆ ۲۰۰۲ء ☆ صفحات: ۳۶۶ ☆ دو سو ساٹھ روپے ☆ ناشر: دوست پبلی کیشنز، ۸-۱اے، خیابان سہروردی، پوسٹ بکس نمبر ۲۹۵۸، اسلام آباد (پاکستان)

📖 **وش منتھن** (ناول)

☆ مصنف: غضنفر ☆ ۲۰۰۴ء ☆ صفحات: ۱۲۰ ☆ ایک سو روپے ☆ ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، لال کنواں، دہلی-۶

📖 **مجلس اقبال** (حصہ دوم) (مضامین)

☆ مرتب: آفاق احمد ☆ ۲۰۰۳ء ☆ صفحات: ۱۳۲ ☆ ایک سو روپے ☆ ناشر: علامہ اقبال ادبی مرکز، بھوپال۔

📖 **نہیں رحمن بابو** (افسانچے)

☆ مصنف: جوگندر پال ☆ ۲۰۰۵ء ☆ صفحات: ۱۶۰ ☆ ایک سو پچیس روپے ☆ ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی-۱۱۰۰۰۶

📖 **کریدتے ہو جو اب راکھ** (ناولٹ)

☆ مصنف: آر۔ ڈی شرما تاثیر ☆ ۲۰۰۴ء ☆ صفحات: ۹۶ ☆ ایک سو پچیس روپے ☆ ناشر: چنڈی گڑھ ساہتیہ اکادمی، چنڈی گڑھ

📖 **آئینہ** (مزاحیہ مضامین)

☆ مصنف: فاروق اجل ☆ ۲۰۰۴ء ☆ صفحات: ۱۴۴ ☆ قیمت: درج نہیں ☆ ناشر: اسلامک کلچرل سینٹر، ماریشس۔

📖 **گلشن گلشن پھول کھلے** (شاعری)

☆ شاعر: شجاع الدین شاہد ☆ ۲۰۰۴ء ☆ صفحات: ۱۳۶ ☆ ایک سو روپے ☆ ناشر: تکمیل پبلی کیشنز، ممبئی (مہاراشٹر)

📖 **فن کتابت نویسی** (گائیڈ بک)

☆ مصنفہ: نرگس جہاں ☆ فروری ۲۰۰۴ء ☆ صفحات: ۱۱۶ ☆ ایک سو پچاس روپے ☆ ناشر:

حسرت موہانی فاؤنڈیشن، ذاکر نگر، نئی دہلی-۲۵

📖 گلدستہ (سبق آموز مضامین)

☆مصنف: پروفیسر مرزا محمد زماں آزردہ ☆۲۰۰۴ء ☆صفحات: ۳۲ (ٹی جلد) ☆پچیس روپے ☆ناشر: مرزا پبلی کیشنز، حسن آباد، رعناواڑی، سری نگر (کشمیر)

📖 احساس کا سفر (افسانے)

☆مصنف: رحیم انور ☆۲۰۰۳ء ☆صفحات: ۱۱۲ ☆پچاس روپے ☆ناشر: جمیل نظام آبادی، ادارہ گونج، احمدی بازار، نظام آباد (آندھرا پردیش)

📖 اسم تاب (شاعری)

☆شاعر: علیم صبانویدی ☆۲۰۰۵ء ☆صفحات: ۱۱۶ ☆تین سو روپے ☆ناشر: علیم صبا نویدی، ۱۲۶، امیر النساء بیگم اسٹریٹ، مونٹ روڈ، چنئی-۶۰۰۰۰۹

📖 گیلے پتوں کی مسکان (شاعری)

☆شاعر: اسلم مرزا ☆۲۰۰۴ء ☆صفحات: ۱۵۲ ☆ایک سو پچاس روپے ☆ناشر: نوائے دکن پبلی کیشنز، مجنوں ہل، رشید پورہ، اورنگ آباد۔

📖 ابابیلیں نہیں آئیں (شاعری)

☆شاعر: حنیف ترین ☆۲۰۰۳ء ☆صفحات: ۱۴۲ ☆دو سو روپے ☆ناشر: استعارہ، ذاکر باغ، نئی دہلی-۱۱۰۰۲۵

📖 سفید جنگلی کبوتر (مضامین)

☆مصنف: منور رانا ☆۲۰۰۵ء ☆صفحات: ۲۲۴ ☆دو سو روپے ☆ناشر: مژگاں پبلی کیشنز، توپسیا روڈ، کولکاتا-۳۹

📖 معلوم نا معلوم (شاعری)

☆نشتر خانقاہی ☆۲۰۰۳ء ☆صفحات۔ ۱۲۸ ☆ایک سو روپے ☆ناشر: نرالی دنیا پبلی کیشنز، دریا گنج، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲

📖 میرے گیت اکیلے رہ گئے (شاعری)

☆شاعر: نذیر فتح پوری ☆۲۰۰۴ء ☆صفحات: ۸۰ ☆ساٹھ روپے ☆ناشر: اسباق پبلی کیشنز، سرہ گاؤں روڈ، پونہ-۴۱۱۰۳۲

📖 اسلام گفتگو متمدن معاشرہ (مضامین ترجمہ)

☆مصنف: سید محمد خاتمی، مترجم: ڈاکٹر اختر مہدی ☆صفحات ۲۰۸ ☆قیمت درج نہیں ☆ناشر: جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی۔

📖 سرگوشیاں زمانوں کی (شاعری)

☆شاعر: عبد الاحد ساز ☆۲۰۰۳ء ☆صفحات: ۲۰۸ ☆ایک سو پچاس روپے ☆ناشر: ایڈشاٹ پبلی کیشنز، میرا روڈ، ممبئی۔

📖 مصلوب (افسانے)

☆مصنف: ناصر بغدادی ☆۲۰۰۴ء ☆صفحات: ۲۴۰ ☆دو سو روپے ☆ناشر: بادبان پبلی کیشنز، گلشن اقبال، کراچی۔

📖 لندن کے رات دن (افسانے)

☆مصنف: علی باقر ☆۲۰۰۴ء ☆صفحات: ۴۴۸ ☆تین سو پچاس روپے ☆تقسیم کار: تخلیق کار پبلشرز، لکشمی نگر، دہلی-۱۱۰۰۹۲

📖 کابوس (ناول)

☆مصنف: شفق ☆۲۰۰۳ء ☆صفحات: ۱۳۶ ☆ایک سو روپے ☆ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی-۱۱۰۰۰۶

📖 کاسۂ شب (شاعری)

☆شاعر: راشد طراز ☆۲۰۰۴ء ☆ صفحات: ۱۰۴ ☆ایک سو روپے ☆ناشر: اردو مرکز، عظیم آباد، پٹنہ

📖 **وفا آواز دیتی ھے** (شاعری)

☆شاعر: اکرام تبسم ☆۲۰۰۴ء ☆صفحات: ۱۲۸ ☆ایک سو روپے ☆ناشر: دستاویز مطبوعات، لاہور (پاکستان)

📖 **روداد انجمن** (رپورتاژ)

☆مصنف: حمید اختر ☆۲۰۰۰ء ☆صفحات: ۲۵۶ ☆ایک سو پچھتر روپے ☆ناشر: برائٹ بکس، اردو بازار، لاہور (پاکستان)

📖 **کیا ھوئے وہ لوگ** (قلمی خاکے)

☆مصنف: معصوم مرادآبادی ☆۲۰۰۴ء ☆صفحات: ۱۶۰ ☆اسی روپے ☆ناشر: خبردار پبلی کیشنز، دریا گنج، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲

📖 **وراثت** (افسانے)

☆مصنف: شفق ☆۲۰۰۳ء ☆صفحات: ۱۶۶ ☆قیمت: ایک سو پچاس روپے ☆ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی-۶

📖 **پار پرے** (ناول)

☆مصنف: جوگندر پال ☆۲۰۰۴ء ☆صفحات: ۱۳۲ ☆ایک سو پچاس روپے ☆ناشر: انشاء پبلی کیشنز، ذکریا اسٹریٹ، کولکاتہ۔

📖 **لاتخف!** (مضامین)

☆مصنف: حقانی القاسمی ☆۲۰۰۴ء ☆صفحات: ۱۴۴ ☆پچھتر روپے ☆ناشر: استعارہ پبلی کیشنز، ذاکر باغ، نئی دہلی-۱۱۰۰۲۵

📖 **طواف دشت جنوں** (مضامین)

☆مصنف: حقانی القاسمی ☆۲۰۰۴ء ☆صفحات: ۳۱۲ ☆دو سو روپے ☆ناشر: استعارہ، ذاکر باغ، نئی دہلی-۱۱۰۰۲۵

📖 **فرید نامہ** (شاعری)

☆شاعر: ڈاکٹر فرید پربتی ☆۲۰۰۳ء ☆صفحات: ۱۳۲ ☆ایک سو پچاس روپے ☆پتہ: ۶۶، گورنمنٹ ہاؤسنگ کالونی، راولپورہ، سری نگر-۵

📖 **فریزر میں رکھی شام** (شاعری)

☆ شاعر: نعمان شوق ☆۲۰۰۴ء ☆صفحات: ۱۴۴ ☆ایک سو پچاس روپے ☆ ملنے کا پتہ: تخلیق کار پبلشرز، لکشمی نگر، دہلی-۱۱۰۰۹۲

📖 **جلتا شکارہ ڈھونڈنے میں** (شاعری)

☆شاعر: نعمان شوق ☆۲۰۰۳ء ☆صفحات: ۱۱۲ ☆ ستر روپے ☆رابطہ: تخلیق کار پبلشرز، لکشمی نگر، دہلی-۱۱۰۰۹۲

📖 **صد غزل** (شاعری)

☆ شاعر: مولانا سید محمد عبادت کلیم طاب ثراہ ☆مرتب: سید احسن اختر سروش ☆ ۲۰۰۴ء ☆ صفحات: ۲۶۸ ☆دو سو پچاس روپے ☆ناشر: مولانا عبادت ایجوکیشنل سوسائٹی (رجسٹرڈ)، امروہہ۔

📖 **بہ یاد جون ایلیا** (مضامین ونظمیں)

☆مرتب: شمیم امروہوی ☆۲۰۰۳ء ☆صفحات: ۱۶۰ ☆ قیمت درج نہیں ☆ ملنے کا پتہ: ڈاکٹر شفاعت فہیم، محلّہ شفاعت پوتہ، امروہہ-۲۴۴۲۲۱

📖 **بدرالدین طیب جی** (یادیں اور تاثرات)

☆مرتب: حسن ضیاء ☆۲۰۰۵ء ☆صفحات: ۱۰۴ ☆ قیمت نوے روپے ☆ ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، لال کنواں، دہلی-۱۱۰۰۰۶

📖 **جب ایسا ھو** (منتخب افسانے)

☆سید ظفر ہاشمی ☆۲۰۰۵ء ☆صفحات: ۲۴۰ ☆ قیمت سو روپے ☆ ناشر: العصر پبلی کیشنز، باغ نشاط، سرکھیج روڈ، احمد آباد (گجرات)

📖 **زیاں کدے میں دوپہر** (شاعری)

☆شاعر: اشہر ہاشمی ☆۲۰۰۵ء ☆صفحات: ۱۲۸
☆قیمت سو روپے ☆ ملنے کا پتہ: اصناف پبلی کیشنز، للتا پارک، لکشمی نگر، دہلی-۹۲

📖 **دیا ساگر ودیا ساگر** (مضامین)

☆مرتب: اشہر ہاشمی ☆۲۰۰۵ء ☆صفحات: ۱۰۸
☆قیمت دو سو روپے ☆ ملنے کا پتہ: اصناف پبلی کیشنز، للتا پارک، لکشمی نگر، دہلی-۹۲

📖 **آہنکار** (ناول)

☆مصنف: نور الحسنین ☆۲۰۰۵ء ☆صفحات: ۱۹۰
☆قیمت ایک سو بیس روپے ☆ ملنے کا پتہ: ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی-۲

📖 **مردم گزیدہ** (افسانے)

☆مصنف: اقبال حسین آزاد ☆۲۰۰۵ء ☆صفحات: ۱۶۰ ☆قیمت ایک سو پچاس روپے ☆ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، لال کنواں، دہلی-۶

📖 **تدریسی آموزشی- حکمت عملیاں** (تعلیمی مضامین)

☆مرتب: ڈاکٹر محمد اختر صدیقی ☆۲۰۰۴ء ☆صفحات: ۲۰۸ ☆قیمت درج نہیں ☆ ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی-۶

📖 **شرف محنت و کفالت** (مضامین)

☆مصنف: شمیم طارق ☆۲۰۰۴ء ☆صفحات: ۱۴۸
☆قیمت ستر روپے ☆ناشر: حاجی غلام محمد اعظم ایجوکیشن ٹرسٹ، ہدایت اللہ روڈ، پونا (مہاراشٹر)

📖 **جھوٹ بولے کوا کاٹے** (طنز و مزاح)

☆مصنف: سبط اختر ☆۲۰۰۴ء ☆صفحات: ۲۰۸
☆قیمت ایک سو پچاس روپے ☆ ملنے کا پتہ: کتابی دنیا، ترکمان گیٹ، دہلی-۶

📖 **خوف کے آسمان تلے** (افسانے)

☆مصنف: مبین مرزا ☆۲۰۰۴ء ☆صفحات: ۲۳۲
☆قیمت دو سو روپے ☆ ملنے کا پتہ: تخلیق کار پبلشرز، آئی بلاک، یاور منزل، لکشمی نگر، دہلی-۹۲-۱۱۰۰

📖 **منظر اور پس منظر** (مضامین)

☆مصنف: حیدر قریشی ☆۲۰۰۴ء ☆صفحات: ۱۶۰
☆قیمت: ایک سو بیس روپے ☆ناشر: سرور ادبی اکیڈمی، جرمنی۔

📖 **اکڑ بکڑ** (بچوں کے ماہیے)

☆مصنف: عادل اسیر دہلوی ☆۲۰۰۵ء ☆صفحات: ۳۲
☆قیمت: بارہ روپے ☆ ناشر: ملک بک ڈپو، ترکمان گیٹ، دہلی-۶

📖 **سوئے حجاز** (سفرنامہ)

☆مصنف: حیدر قریشی ☆۲۰۰۴ء ☆صفحات: ۱۳۶
☆قیمت: ایک سو روپے ☆ناشر: سرور ادبی اکیڈمی، جرمنی۔

📖 **افق زاد** (ہائیکوز)

☆مرتب: علیم صبا نویدی ☆۲۰۰۴ء ☆صفحات: ۱۰۸
☆قیمت: ڈھائی سو روپے ☆ ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی-۱۱۰۰۰۶

📖 **حیدر قریشی سے لئے گئے انٹرویوز** (انٹرویوز)

☆مرتب: سعید شباب ☆۲۰۰۴ء ☆صفحات: ۱۶۰
☆قیمت: سو روپے ☆ناشر: نظامیہ آرٹ اکیڈمی، ایمسٹرڈم، ہالینڈ۔

📖 **فساد، کرفیو، کرفیو کے بعد** (مختصر ترین کہانیاں)

☆ مصنف: عبدالعزیز خان ☆۲۰۰۵ء ☆صفحات: ۱۰۴

☆قیمت: ایک سو تیس روپے ☆ناشر: خان پبلی کیشنز، ای۔آر۔روڈ، ممبئی۔

شعورِ تنقید (مضامین)
☆مصنف: ڈاکٹر تاج پیامی ☆۲۰۰۴ء ☆صفحات: ۱۷۳ ☆قیمت: ایک سو پچیس روپے ☆ملنے کا پتہ: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، لال کنواں، دہلی-۶

شہر صبا (شاعری)
☆شاعر: یوسف اعظمی ☆۲۰۰۳ء ☆صفحات: ۱۴۴ ☆ایک سو پچاس روپے ☆ناشر: ادارہ تہذیب ادب، حیدرآباد (آندھراپردیش)

مژگاں (سہ ماہی)
☆مرتب: نوشاد مومن ☆اردو ڈرامہ نمبر ☆جون ۲۰۰۴ء ☆صفحات: ۴۵۶ ☆سو روپے ☆پتہ: مژگاں پبلی کیشنز، احمد ولا، توپسیا روڈ، کولکاتہ-۳۹

اردو بک ریویو (ماہنامہ)
☆مدیر: محمد عارف اقبال ☆صفحات: ۹۶ ☆بیس روپے ☆پتہ: نیو کوہِ نور ہوٹل، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲

تشکیل (سہ ماہی)
☆مدیر: احمد ہمیش ☆نومبر ۲۰۰۴ء ☆صفحات: ۲۷۲ ☆ایک سو روپے ☆رابطہ: تخلیق کار پبلشرز، لکشمی نگر، دہلی-۹۲

استعارہ (سہ ماہی)
☆مدیر: حقانی القاسمی ☆صفحات ۲۶۴ ☆ایک سو روپے ☆پتہ: ذاکر باغ، نئی دہلی-۲۵

تکمیل (سہ ماہی)
☆مدیر: مظہر سلیم ☆جون ۲۰۰۴ء ☆صفحات ۲۹۶ ☆ایک سو پچاس روپے ☆پتہ: تکمیل پبلی کیشنز، شانتی نگر، بھونڈی، ضلع تھانے-۴۲۱۳۰۲

گلبن (دو ماہی)
مدیر: سید ظفر ہاشمی ☆اپریل ۲۰۰۵ء ☆صفحات: ۱۲۰ ☆قیمت: سالانہ ۸۰/روپے ☆پتہ: ۳۰-۳۱، حسن گارڈن کالونی، کرگل روڈ، کتا پوسٹ، چنہٹ، لکھنؤ-۵

شیش (ہندی/دو ماہی)
☆مدیر: حسن جمال ☆مارچ ۲۰۰۵ء ☆صفحات: ۱۷۶ ☆بیس روپے ☆پتہ: پنا نواس، لوہار پورہ، جودھپور (راجستھان)

تناظر (سہ ماہی)
☆مدیر: بلراج ورما ☆خصوصی شمارہ فکشن نمبر ☆صفحات: ۲۴۰ ☆ایک سو بیس روپے ☆پتہ: D/24، پاکٹ-۳، میورو ہار فیز-۱، دہلی-۱۱۰۰۹۱

انتخاب (شمارہ: ۷)
☆مدیر: علیم اللہ حالی ☆صفحات: ۹۶ ☆بیس روپے ☆پتہ: انتخاب پبلی کیشنز، وہائٹ ہاؤس کمپاؤنڈ، گیا۔(بہار)

عالمی اردو ادب (سالنامہ)
☆مدیر: نند کشور وکرم ☆خصوصی شمارہ: علی سردار جعفری ☆صفحات: ۴۰۰ ☆دو سو پچاس روپے ☆پتہ: ج-۶، کرشنا نگر، دہلی-۱۱۰۰۵۱

افلاک (ضلع گلبرگہ کے نمائندہ قلمکاروں کا انتخاب)
☆مرتبین: اکرم نقاش، انیس صدیقی ☆صفحات: ۵۶۴ ☆دو سو روپے ☆پتہ: افلاک پبلی کیشنز، وہائٹ ہاؤس، نیو بینک کالونی، بلال آباد، گلبرگہ-۵۸۵۱۰۴

نیا سفر (شمارہ: ۳)
☆مدیر: ڈاکٹر قمر رئیس ☆صفحات: ۱۹۶ ☆چالیس روپے ☆پتہ: سی-۱۶۶، ویویک وہار، دہلی-۹۵

OO

تخلیق کار پبلشرز کی مطبوعات ایک نظر میں

پھول جیسے لوگ (ناول) انور خان -/۸۰
یاد بسیرے (افسانے) انور خان -/۸۰
لمحوں کی قید (افسانے) کشور سلطانہ -/۸۰
افسانہ ۸۹ء (انتخاب) مرتب: انیس امروہوی -/۸۰
موج سحر (شاعری) ڈاکٹر انجنا سندھیر -/۸۰
قند وزقند (طنز ومزاح) فیاض احمد فیضی -/۱۵۰
برزخ (افسانے) ہاجرہ شکور -/۸۰
فرات (ناول) حسین الحق -/۱۰۰
نیلام گھر (ناول) مشرف عالم ذوقی -/۹۰
کیا مزاق ہے (مزاحیہ شاعری) اسمٰعیل آذر -/۸۰
گھٹتے بڑھتے سائے (افسانے) علی امام نقوی -/۶۰
بھوکا ایتھوپیا (افسانے) مشرف عالم ذوقی -/۱۱۰
کانچ کی چادر (شاعری) مریم غزالہ -/۸۰
رنگین پرواز (اردو/ہندی شاعری)
پی۔این۔رنگین -/۸۰
اردو تنقید حالی سے کلیم تک (تحقیق)
سید محمد نواب کریم -/۱۲۵
دل کی بات (افسانے) ڈاکٹر شبیر صدیقی -/۶۰
کاغذ کی دیوار (افسانے) محافظ حیدر -/۶۰
ادھار کی زندگی (افسانے) مہر چند کوشک -/۶۰
اردو مثنویوں میں جنسی تلذذ (تنقید)
ڈاکٹر محبوب اعلیٰ قریشی -/۱۲۵
رت جگے (شاعری) رحمت امروہوی -/۶۰
پیاسا سمندر (افسانے) عقیلہ تبسم -/۶۰
ڈار سے بچھڑے (افسانے) سید محمد اشرف -/۱۰۰
غالبیات اور ہم (تحقیق) ڈاکٹر ابو محمد سحر -/۵۰
آخری داستان گو (ناول) مظہر الزماں خاں -/۸۰

رشید احمد صدیقی کے اُسلوب کا تجزیاتی مطالعہ (تنقید)
خواجہ محمد اکرام الدین -/۶۰
دختر ابلیس (افسانے) محمد شبیر علی محمودی -/۶۰
حکیم کلب علی شاہد: شخصیت اور فن (مقالے)
خورشید مصطفیٰ رضوی -/۶۰
ہم مسافر جہاں جہاں پہنچے (سفرنامہ) علیم اللہ حالی -/۶۰
ساغر نظامی: حیات اور ادبی خدمات (تحقیق)
ڈاکٹر سلمیٰ شاہین -/۱۰۰
مرزا رسوا کے ناولوں کے نسوانی کردار (تحقیق)
ڈاکٹر توحید خاں -/۸۰
لیکن جزیرہ نہیں (افسانے) تبسم فاطمہ -/۶۰
اپٹا اور اردو ڈراما (تحقیق) شاہد رزمی -/۶۰
روتا ہوا آدمی (افسانے) رئیس نجمی امروہوی -/۸۰
فلسطین کے چار ممتاز شعراء (تنقید)
عبدالحق حقانی القاسمی -/۶۰
کنیادان (ڈرامے) وجے تنڈلکر
(اردو ترجمہ: ڈاکٹر صادق) -/۸۰
شہر چپ ہے (ناول) مشرف عالم ذوقی -/۹۰
بیان (ناول) مشرف عالم ذوقی -/۱۰۰
منڈیر پر بیٹھا پرندے (افسانے) احمد صغیر -/۶۰
سخنورانِ شاہجہاں پور (تذکرہ) مبارک شمیم -/۱۲۵
راہ میں اجل ہے (افسانے) زاہدہ حنا -/۱۰۰
مطالعہ مثنویات مصحفی (تنقید) ڈاکٹر سعیدہ وارثی -/۱۰۰
بے زبانی کا ہنر (شاعری) ڈاکٹر سجاد سید -/۶۰
حجاب امتیاز علی: حیات اور ادبی کارنامے (شخصیت)
مجیب احمد خاں -/۸۰
اسرار غالب (تنقید) سید قدرت نقوی -/۶۰

اردو فکشن کی تنقید (تنقید) ڈاکٹر ارتضیٰ کریم ۔/۲۵۰
تذکرۂ خطیر (تحقیق) تاباں نقوی امروہوی ۔/۵۰
مشافہ (انٹرویوز) معصوم مرادآبادی ۔/۸۰
سنگ اُٹھانے کا حوصلہ (افسانے) رضاء الجبار ۔/۸۰
مظہر امام کی تنقید نگاری (تنقید) محمد رضا کاظمی ۔/۶۰
تلخیص (مضامین) ڈاکٹر علیم اللہ حالی ۔/۶۰
بستر (افسانے) قاسم خورشید ۔/۶۰
جوگندر پال کے افسانوں کا انتخاب (افسانے)
مرتب: انیس امروہوی ۔/۹۰
ازبکستان: انقلاب سے انقلاب تک (سفرنامہ)
ڈاکٹر قمر رئیس ۔/۱۰۰
کن فیکون (افسانے) رضوان احمد ۔/۹۰
ادب میں گھوسٹ ازم (طنز و مزاح)
ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی ۔/۸۰
سلسلے (شاعری) مدہوش بلگرامی ۔/۶۰
اجنبی ساعتوں کے درمیان (شاعری) نعمان شوق ۔/۶۰
ایک جام اور...... (شاعری) فرحت قادری ۔/۶۰
سوادِ جاں (شاعری) مبارک شمیم ۔/۶۰
رابطہ (تنقید) جوگندر پال ۔/۹۰
جمیل مظہری: بحیثیت نثر نگار (تنقید)
ڈاکٹر نعمت اللہ ۔/۸۰
ایک غیر مشروط معافی نامہ (افسانے) خورشید اکرم ۔/۸۰
جدید ہندی شاعری (تنقید) خورشید اکرم ۔/۸۰
منڈی (افسانے) مشرف عالم ذوقی ۔/۱۰۰
تکمیل (شاعری) من موہن تلخ ۔/۸۰
سوئی کی نوک پر رُکا لمحہ (افسانے) حسین الحق ۔/۸۰
قمر رئیس: ایک زندگی (شخصیت)
مرتب: ڈاکٹر سلمیٰ شاہین ۔/۲۵۰

بے اصطلاح (مضامین) جوگندر پال ۔/۹۰
ٹھہرے ہوئے لوگ (افسانے) انجم عثمانی ۔/۸۰
اردو افسانے کا پس منظر (تنقید) فیاض رفعت ۔/۶۰
دستک (شاعری) اختر شاہجہاں پوری ۔/۸۰
بے ارادہ (افسانے) رفیع حیدر انجم ۔/۸۰
ادب کی تفہیم (تنقید) ڈاکٹر شمس الحق عثمانی ۔/۸۰
آئینے کی گرد (افسانے) شکیل جاوید ۔/۸۰
ہندوستان میں جنگ جمہوریت (سوانح)
جگت رام ساہنی ۔/۹۰
سب رس: جدید اردو میں (تنقید) قاضی انیس الحق ۔/۱۵۰
وینس کا پھول (افسانے) سہیل اعجاز صدیقی ۔/۹۰
موسم عذابوں کا (افسانے) علی امام نقوی ۔/۸۰
غلام بخش اور دیگر کہانیاں (افسانے)
مشرف عالم ذوقی ۔/۱۲۰
وہ دن (افسانے) غیاث الرحمٰن ۔/۸۰
مراثیٔ شاد کا فکری پہلو (تنقید) پروفیسر اظہار احمد ۔/۱۰۰
شام اودھ (ڈرامے) ڈاکٹر شبیر صدیقی ۔/۱۰۰
اردو کے نثری اسالیب (تنقید) شہاب ظفر اعظمی ۔/۱۵۰
کلیم الدین احمد کی تنقید کا تنقیدی جائزہ (تنقید)
ڈاکٹر ابرار رحمانی ۔/۱۵۰
جھلستے جنگل (ناول) انور عظیم ۔/۱۰۰
اردو افسانے پر مغربی ادب کے اثرات (تنقید)
ڈاکٹر شہناز شاہین ۔/۱۲۰
میری کہانی (سوانح) اویس احمد دوراں ۔/۱۲۰
دس دن (ناول) ذرا واسا ۔/۹۰
پرندے (افسانچے) جوگندر پال ۔/۹۰
ہوئے ہم دوست جس کے (شخصی خاکے)
مجتبیٰ حسین ۔/۸۰

مثنوی مناقب خواجہ (شاعری)
محمد علی موج رام پوری -/50
معاصر اسلامی تحریکات اور فکرِ اقبال (تنقید)
ڈاکٹر شجاع الدین فاروقی -/150
آخر کب تک (ناول) اقبال نظامی -/100
ساختیات: تاریخ، نظریہ اور تنقید (تنقید) احمد سہیل -/200
ذبح (ناول) مشرف عالم ذوقی -/90
زندہ اپنی باتوں میں: بیدی، عصمت اور عباس (انٹرویوز)
فیاض رفعت -/90
مضامین نو (مضامین) نرگس سلطانہ -/100
اردو میں قصیدہ نگاری (تنقید) ڈاکٹر ابو محمد سحر -/150
لابوہیم (افسانے) انور عظیم -/120
بساط (ناول) علی امام نقوی -/100
مٹی کے حرم (ناول) ساجدہ زیدی -/250
کلیات کیف (شاعری) کیف گنگوہی -/150
مکالمہ (آجکل کے اداریے)
محبوب الرحمٰن فاروقی -/200
اردو شاعری کے روشن چراغ (تذکرہ)
طارق متین بانچتی -/100
آدھی رات کی شبنم (شاعری) مرغوب علی -/100
مشرقی ہند میں اردو نکڑ ناٹک (تحقیق) ڈاکٹر محمد کاظم -/100
صوبہ سرحد میں جنگِ آزادی (سوانح)
جگت رام ساہنی -/100
اصطلاحاتِ نفسیات: تشریح و تفہیم
سیّد اقبال امروہوی -/200
کارواں گزر گیا (افسانے) ایم۔ ایچ۔ خان -/120
حاضر حال جاری (افسانے) سریندر پرکاش -/250
واپسی سے پہلے (افسانے) صغیر رحمانی -/150

نادید (ناول) جوگندر پال
ہرچرن چاؤلہ: فن اور شخصیت (مضامین)
مرتب: ڈاکٹر نگار عظیم
ادراکِ فن (تذکرہ) اختر شاہ جہاں پوری
گمشدہ آدمی (افسانے) یٰسین احمد
جدید نفسیات (نفسیاتی مضامین)
سیّد اقبال امروہوی
غمِ دل وحشتِ دل (ناول) ڈاکٹر محمد حسن
بلونت سنگھ: فن اور شخصیت (تحقیق) ممتاز آراء
بھگت سنگھ کی واپسی (ڈرامے) ساگر سرحدی
مسیحا کی موت (افسانے) قاضی انیس الحق
شہر نگاراں (ناول) رفعت سروش
رسالہ "جامعہ" کا تنقیدی مطالعہ (تحقیق)
ڈاکٹر فرزانہ خلیل
فرات: مطالعہ، محاسبہ (تنقید)
مرتب: ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی
فساد (ناول) مہر الدین خاں
گلدستۂ بیت بازی (شعری انتخاب)
مرتب: ڈاکٹر شجاع الدین فاروقی
انتخاب کلیات ن۔م۔ راشد/ مرتب: مرغوب علی
تنقیحات (تنقیدی مضامین) ڈاکٹر قمر جہاں
مضامین ہفت رنگ (تنقیدی مضامین)
محبوب الرحمٰن فاروقی
جوگندر پال کی کہانیاں (افسانے) جوگندر پال
جوش ملیح آبادی: خصوصی مطالعہ مرتب: ڈاکٹر قمر رئیس
تپش (افسانے) ولی محمد چودھری
نثری بیانیہ (تنقید) ڈاکٹر مجید بیدار
درد کا رشتہ (افسانے و ناولٹ) راشد سہوانی

ر الملک فخر امروہہ (شخصیت)
مرتب: ڈاکٹر شجاع الدین فاروقی ۔/۲۰۰
ئی چیز (بچوں کی کہانیاں) شکیل جاوید ۔/۱۲۰
رگاہِ خیال (مضامین) پروفیسر ساجدہ زیدی ۔/۲۰۰
ع شاد (شاعری) منشی بشن دیال شاد دہلوی ۔/۱۰۰
داوِ انجمن (رپوتاژ) حمید اختر ۔/۲۰۰
رت: زندگی کا زنداں (مضامین) زاہدہ حنا ۔/۲۵۰
ردو ناول کے اسالیب (تنقید)
ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی ۔/۲۵۰
ائبان (شاعری) اختر شاہجہاں پوری ۔/۱۵۰
اش و تعبیر (اختر شاہجہاں پوری کے فن پر مضامین)
مرتب: مدہوش بلگرامی ۔/۱۸۰
یک کتاب اور...... (طنز و مزاح) یوسف ناظم ۔/۱۵۰
وزمرہ کی نفسیات (نفسیاتی مضامین)
سید اقبال امروہوی ۔/۱۸۰

مولانا شبلی: ایک تنقیدی مطالعہ (تنقید)
ڈاکٹر نیر جہاں ۔/۲۵۰
نقد نگاہ (تنقید) لطف الرحمٰن ۔/۲۰۰
قمر رئیس: ادبی و علمی شناخت (شخصیت)
مرتب: خوشنودہ نیلوفر ۔/۲۰۰
پریم چند: نئے تناظر میں (تنقید) علی احمد فاطمی ۔/۲۰۰
عورت اور سماج (تنقید) ڈاکٹر محمد شہزاد شمس ۔/۱۴۰
وہ بھی ایک زمانہ تھا (فلمی شخصیات)
انیس امروہوی ۔/۲۵۰
اور پھر نیا کیا ہے (شاعری) حفیظ آتش ۔/۱۲۰
پس پردہ (فلمی مضامین) انیس امروہوی ۔/۲۰۰
خواب نگر (شاعری) ڈاکٹر محمد حسن ۔/۱۸۰
جان پہچان (انٹرویوز) رئیس صدیقی ۔/۱۸۰
چاہت کے رنگ (ناول) ایم۔ طاہر تنویری ۔/۲۰۰

ہماری آئندہ اشاعتیں

یک اور بٹوارہ (تنقید) مرتبین: انیس امروہوی، مرغوب علی
سفر کہانی (پاکستانی سفرنامہ) مرغوب علی
شاید یعنی گمان (انتخاب کلیات) جون ایلیا
ممتاز مفتی: ایک مطالعہ (شخصیت) مرتب: انیس امروہوی
دو زاویے (شعری انتخاب) مرتب: انیس امروہوی
سلیم اختر: خصوصی مطالعہ (شخصیت)
مرتبین: انیس امروہوی، مرغوب علی
سلسلے (مضامین) ہرچرن چاولہ
گلستانِ بیت بازی (شعری انتخاب) مرتبہ: ڈاکٹر نیر جہاں
یہ خلد بریں ارمانوں کی (شہروں کا تذکرہ) مرتب: شکیل اختر

نجات دہندہ کی تلاش (افسانے) وجے
پال پیچیاسی (افسانے) جوگندر پال
پل دو پل (افسانے) انور عظیم
ہیرا منڈی (تجزیہ) زاہد عکاسی
مٹھی بھر سانپ (افسانے) ڈاکٹر سلیم اختر
سایہ او نچے پیڑ کا (افسانے) شکیل جاوید
انتخاب کلیاتِ مصحفی (شعری انتخاب) مرتب: مرغوب علی
جذبی: ایک مطالعہ (شخصیت) مرتب: انیس امروہوی
نوشاد: ایک زندگی (شخصیت) مرتب: انیس امروہوی
غبارِ راہِ غم (شاعری) پروفیسر ساجدہ زیدی

رابطہ: **تخلیق کار پبلشرز**، ۱۰۴/بی، یاور منزل، آئی بلاک، لکشمی نگر، دہلی۔۱۱۰۰۹۲

QISSEY (Urdu)
R. N. I. No. 47285/87
104/B, Yawar Manzil, I - Block, Laxmi Nagar, DELHI-110092

تخلیق کار پبلشرز کی اہم مطبوعات
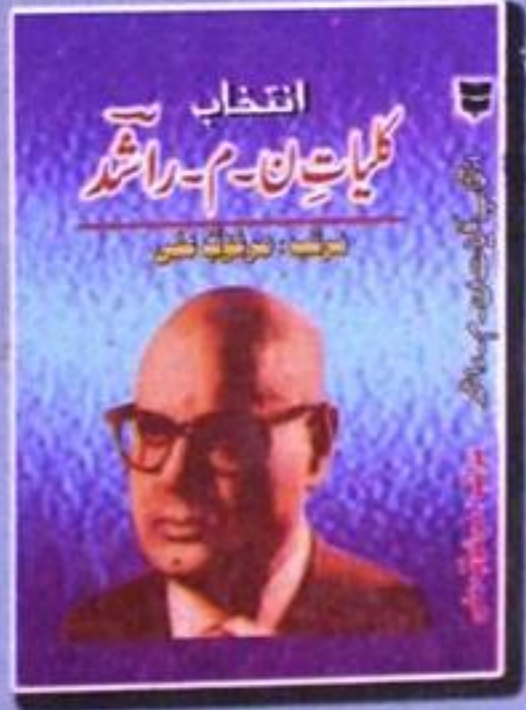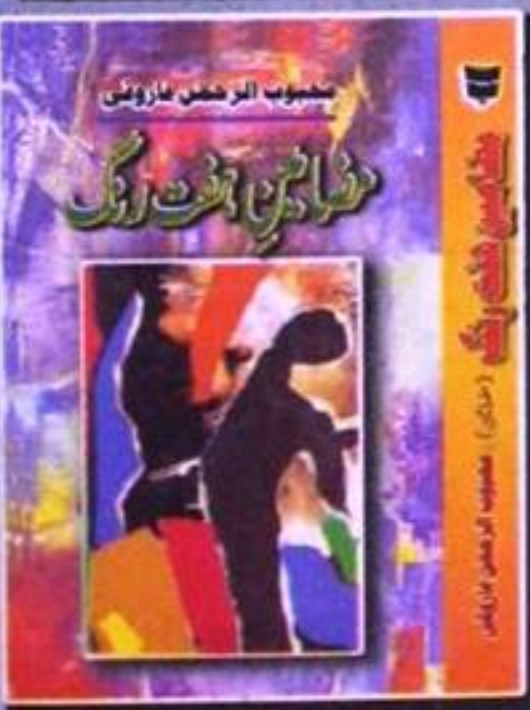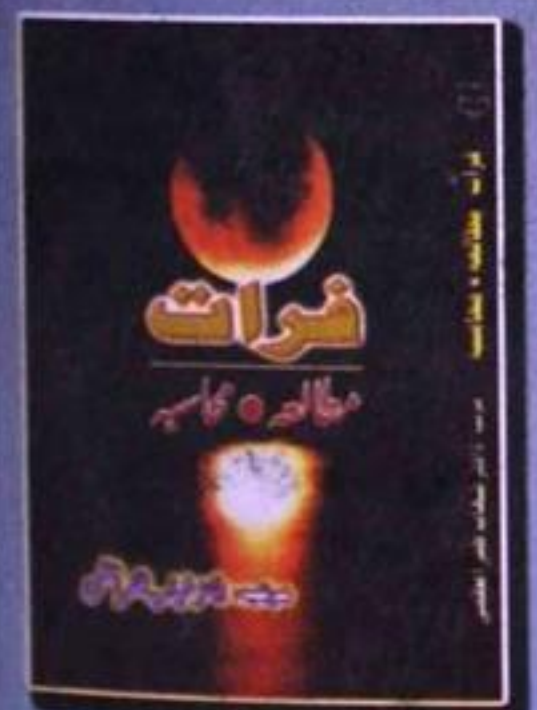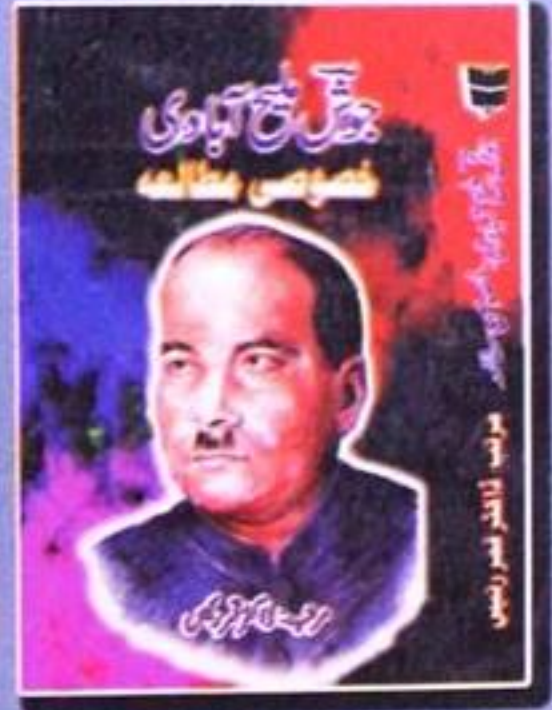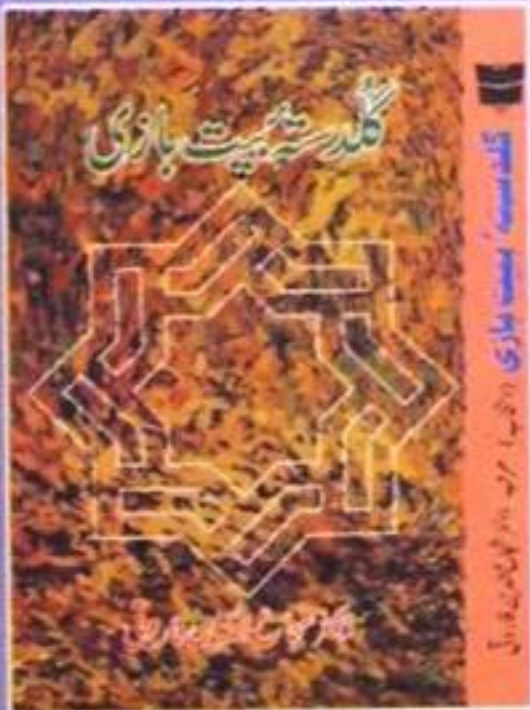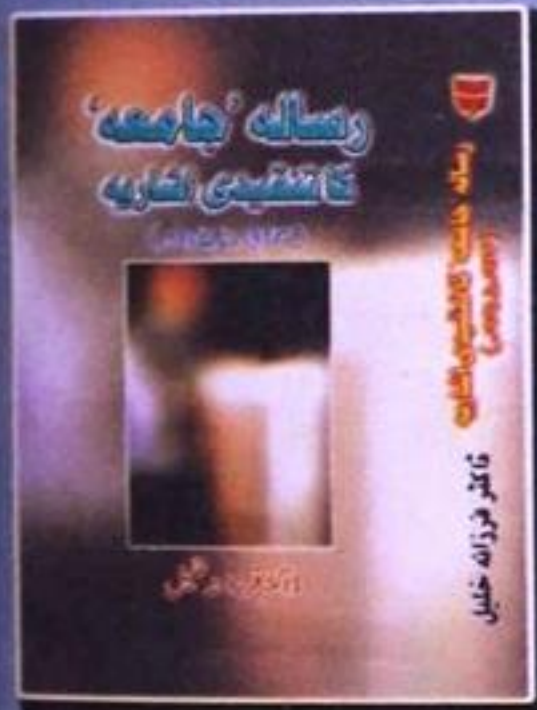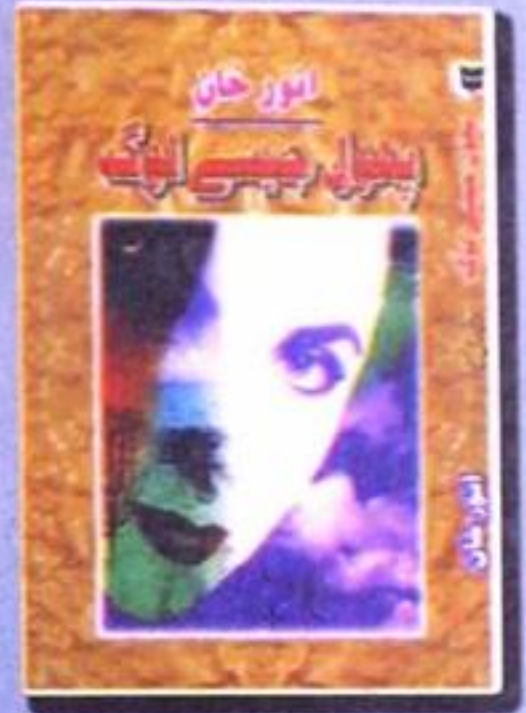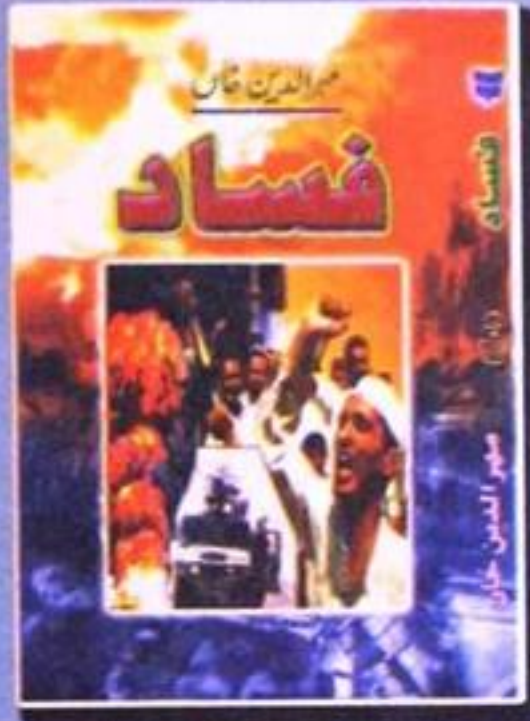
TAKHLEEQKAR PUBLISHERS
104/B, Yawar Manzil, I-Block, Laxmi Nagar, Delhi-110092
Ph : 011-55295989, 22442572 E-mail : qissey@rediffmail.com